مظفر حنفی

حقوق ——— بحق مظفر حنفی محفوظ

طابع ——— علوی پریس بھوپال

خطاط ——— محمد عمر خوشنویس

سرورق ——— نایاب

سنہ اشاعت ——— [illegible]

تعداد اشاعت ——— [illegible]

قیمت ——— چار روپے

تقسیم کار:-

(۱) شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی، الٰہ آباد

(۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

(۳) کتاب پبلشرز، ... لکھنؤ

(۴) نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

(۵) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، نزد جے جے ہاسپٹل بمبئی

(۶) مکتبہ شاہراہ - اردو بازار، دہلی ۶

ناشر

اشفاق ہاشمی، فن کدہ، سیہور (ایم پی)

اُس کے نام

جس کا نام نہیں لے سکتا!

مظفر حنفی

یکم جنوری ۱۹۶۹ء

انگلیاں خون اگلتی ہوں گی
جب حقیقت کو رقم کیجیے گا!

مظفر حنفی

پیش لفظ

مظفر حنفی سے میں غائبانہ طور پر متعارف ضرور ہوں۔ کون پڑھا لکھا نہیں! مجھے اُس کی نظمیں پڑھنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے اور ساتھ ہی یہ احساس بھی کہ وہ ایک ذہین شاعر ہے جسے جاہے جدید نظمیں لکھنے کا جنون ہے لیکن جو کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اچھی غزل بھی کہہ لیتا ہے۔

جب مجھے اُس کے افسانوں کا مسودہ (ملاقی دوڈرم) ملا تو مجھے خیال آیا یہ کوئی اور مظفر حنفی ہے۔ یہ بات ناممکنات میں سے نہیں تھی۔ آخر جب جگر دو ہو سکتے ہیں۔ (جگر مرادآبادی) اور جگر بریلوی) اور آزاد تین (محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، جگن ناتھ آزاد) اور ساحر بے شمار، تو مظفر حنفی دو کیوں نہیں ہو سکتے؟ بعد ازاں مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ شاعر مظفر حنفی اور افسانہ نویس مظفر حنفی دراصل ایک ہی شخص ہے۔

عام طور پر شاعر، افسانہ نویس نہیں ہوتے اور افسانہ نویس (چاہے وہ کبھی کبھار شعر و شاعری کرتے ہیں) شاعر نہیں بن سکتے۔ احمد ندیم قاسمی کی بات جدا ہے لیکن کیا آپ پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور خواجہ احمد عباس سے کبھی توقع کر سکتے ہیں کہ وہ شعر تو کیا ایک کام کا مصرع بھی موزوں کر سکیں گے۔

مظفر حنفی کا کلام دیکھا تھا، اُس کے افسانے پڑھ کر میری نظروں میں اُس کی توقیر دو چند ہو گئی۔ میں نے سوچا اس ادبی مجاہد کی نیام میں دو تلواریں ہیں اور دونوں کا وار کاری ثابت ہوتا ہے۔ مسودہ ختم کرنے کے بعد مجھے بے اختیار اُسی کی غزل کے دو شعر یاد آگئے:

ظالم کے سوچنے کا طریقہ ہی اور ہے — اس کے دل و دماغ کی دنیا ہی اور ہے
حالات کا اگرچہ تقاضہ ہی اور ہے — مرتے ہیں لوگ زلف و لب و رُخ کے نام پر

میری دانست میں اُس کے افسانوں پر جو صحیح ترین تبصرہ کیا جا سکتا ہے وہ ان اشعار میں مرکوز یا مرقوم ہے۔ واقعی اُس کے سوچنے کا طریقہ انفرادی اور جداگانہ ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کو ایک نئے زاویئے سے دیکھنے کا عادی ہے۔ چاہے وہ ظریف ہے یا شاعر اُس کے سر پر یہ دُھن سوار ہے کہ زندگی کی ستم ظریفیوں کو بے نقاب کرے۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے وہ اکثر افسانے کے اختتام کو ایک ناگہانی موڑ دیتا ہے جسے "نیش عقرب" سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں "تشنگی دل کی" "ستاروں کا کھیل" اور "ڈربہ" کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

بحیثیت افسانہ نگار مظفر حنفی کو اپنی سماجی ذمہ داری کا بھرپور احساس ہے وہ انسانی قدروں پر نہایت لطیف اور چابکدست انداز میں طنز کرنے کے فن میں مشاق ہے "بلا کی دوڑ" میں اس نے خدا کو نشانہ تمسخر بنایا ہے۔ اُس خدا کو جو سُنتا ہوا بھی نہیں سُنتا اور دیکھتا ہوا بھی نہیں دیکھتا۔ جو بے کس اور مظلوم بندوں کی مدد نہیں کر سکتا۔ شاید اسی لئے کہ وہ خود بے بس اور بے حس ہے۔ "ہم شریف ہیں" میں اُس نے شرافت کے ہوائی پردے کی دھجیاں اُڑائی ہیں اور "بھیک" میں بیکاری کے مسئلہ پر قلم اٹھانے کے بعد اسی دلچسپ نتیجہ پر پہنچا ہے:

"میں نے محسوس کیا جیسے واقعی اس بیکاری اور ذہنیت کا واحد علاج جنگ ہے"

صرف جنگ، جیسے میں اور احمد جیسے لاکھوں بیکار اور بلند حوصلہ نوجوان مل کر لڑیں گے
اور پھر میرے اور احمد جیسے گندے انڈے اپنی ماؤں کے لال بن جائیں گے اور ان کے
لئے یہ دنیا ہی سچ مچ ایسی جنت بن جائے گی جو ماں کے قدموں میں ہوتی ہے اور پھر کوئی
ماں اپنے بیٹے کو نہ کوسے گی۔ بھوک، بیکاری، افلاس، ظلم اور مصیبت کے خلاف لڑی
جانے والی اس جنگ کے بعد پھر امن کا جو پرچم لہرائے گا۔ اس کے بعد کوئی جنگ نہ ہوگی۔"

مندرجہ بالا اقتباس اس کے اسلوب بیان کی بہت عمدہ مثال ہے۔ وہ نثر
میں شاعری کرنے سے گریز کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا طرز تحریر ہر قسم کے تصنع سے مبرا
ہے اور اس پر آتش کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی	قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

چند اور اقتباسات ملاحظہ فرمایئے :۔

"اس کی بیوی پنکھا جھلتے ہوئے حاشیہ لگاتی ۔۔۔ اس مکان سے تو طبیعت
اوب گئی۔ نگوڑ مارا مکان ہے کہ مرغی کا ڈربہ ۔۔۔" (ڈربہ)

"حمید کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل پکڑ کر نوچ لیا ہو، تقریباً بیہوشی کے
عالم میں اس نے قبرستان جاکر نماز جنازہ ادا کی، واپس آیا تو ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔
حمید نے جیسے تیسے اذان دے کر جماعت کو نماز پڑھائی اور جب اس نے نماز ختم کر کے
دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس کے دل میں پہلی بار خدا کے لئے بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔"
(ملا کی دوڑ)

"بس پھر کیا تھا، یک نہ شد دو شد، میرا ایک دوست مجھے اس معاملہ میں حق
بجانب سمجھتا تھا، دل پھول کی طرح کھل گیا، یادوں کے دریچے کھل گئے۔ تمام پچھلے واقعات
کی یاد تازہ ہو گئی اور ہر جانے میں گھوم پھر کر جعفری منظا کا پایا گیا ۔۔۔۔"
(ہم شریف ہیں)

"جی چاہتا ہے شرافت کا لبادہ اُتار پھینکوں، میں بھی اُن کے ساتھ رل کر خرمستیاں کروں، لڑوں اور لڑ کر دبک جاؤں اور بھونڈی آواز میں الاپوں اور .... پھر سوچتا ہوں، میں تو شریف ہوں ۔۔۔"

(ہم شریف ہیں)

مظفر حنفی محفل افسانہ نویسی میں نووارد ضرور ہے لیکن نومشق اور نوآموز ہرگز نہیں اُس کے افسانے بڑے جاندار ہیں اور اُن کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بادی النظر میں وہ سہل ممتنع کے نمونے نظر آتے ہیں لیکن اس سادگی میں غضب کی پُرکاری ہے۔ بقول ذوق ؎

ہے اُن کی سادگی بھی تو کس کس پھبن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

کنہیا لال کپور

ڈی۔ ایم کالج۔ موگا (پنجاب)
۲۲ مارچ ۱۹۶۷ء

اعتراف

"دیدۂ حیراں" میں شامل سبھی افسانے سنہ ۱۹۵۸ء سے سنہ ۱۹۶۲ء کے دوران لکھے گئے ہیں اور اسی درمیان مختلف ادبی رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ یاد ش بخیر! یہ وہ دور تھا جب آج کا جدید افسانہ وجود میں نہ آیا تھا اور افسانہ نگاروں میں رام لعل، ذکی انور، اقبال فرحت اعجازی، غیاث احمد گدی، ستیہ پال آنند اور راقم الحروف وغیرہ کی گنتی جدید افسانہ نگاروں میں ہوتی تھی پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں شاد عارفی مرحوم کا شاگرد ہو کر شاعری کے چکر میں افسانہ نگاری کے کام کا نہ رہا۔ اسی اثنا میں دوسری زبانوں کی طرح اردو افسانے کا مزاج بھی یک لخت بدل گیا اور آج رام لعل تو کجا اُس کے بہت بعد کی پیداوار جوگیندر پال اور قاضی عبدالستار جیسے اہم نام شامل ہیں پرانی سمجھی جانے لگی۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ میرے سابقہ افسانوی مجموعے "اینٹ کا جواب" پر جو تبصرے اور تنقیدیں کی گئیں اُن میں زمانۂ تصنیف کو نظر انداز کر کے موجودہ افسانوی منظر کے [illegible] فیصلے کئے گئے جبکہ کسی تخلیق کی صحیح قدر و قیمت اس کے زمانۂ تصنیف کو ذہن میں رکھ کر آنکی جانی چاہئے۔ مختصر یہ کہ میں جدید شاعر تو ضرور ہوں، جدید افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ نہیں، مقصد صرف اتنا ہی عرض کرنا تھا۔

مظفر حنفی
۱/۱/۶۹

میراتی پورہ، بھوپالی گیٹ، سیہور
یکم جنوری ۱۹۶۹ء

اِس کتاب میں

افسانے

بوجھل پردہ۔ ننگی ذہنیت

آخر میں نے ہمت کر کے آواز لگا ہی دی ــــــــ

"حسین رضا صاحب!"

اپنی پاٹ دار آواز پر میں اکثر جھنجھلایا کرتا ہوں لیکن آج وہی کام دے گئی۔

"امّی! دروازے پر کوئی آدمی آواز دے رہا ہے" کسی لڑکی نے گھر میں اعلان کیا۔

"اری چپ کمبخت! ماسٹر صاحب ہیں۔" اوپر چلمن سے جھانک کر ایک محترمہ سہمے ہوئے لہجے میں بولیں اور میں نے اپنے جسم پر ایک نگاہ ڈالی ــــــ کیا میرے آدمی ہونے میں کوئی شک تھا۔

"تشریف لائیے ماسٹر صاحب!" اندر سے کوئی بڑی بی مجھ سے بھی زیادہ بھاری آواز میں دہاڑیں۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر چہرے کا پسینہ پونچھا اور چق اٹھا کر اندر

چلا گیا۔ لمبی سی ڈیوڑھی پار کر کے اندر صحن میں آیا تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں!

کھڑا ہو کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"ارجمند — ایک پردہ کر لیا —؟" داہنی طرف باورچی خانے سے بڑی بی نے حلق پھاڑ کر پوچھا۔ میری نظر سہوًا اس طرف اٹھ گئی۔ دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔

"جی — آجائیے۔ ماسٹر صاحب!" اوپر سے آواز آئی۔ جیسے بہت سی چاندی کی گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔

"زینہ اُس طرف داہنے ہاتھ کو مُڑ کر ہے۔" بڑی بی نے باورچی خانے سے اس طرح رہبری کی جیسے اندھے کو راستہ دِکھلا رہی ہوں اور میں لپک کر زینے پر چڑھ گیا۔

کمرہ کافی سجا ہوا تھا۔ بیچوں بیچ ایک بوجھل کپڑے کا پردہ کمرے کو دو حصوں میں منقسم کر رہا تھا۔ میرے لئے پردے کے پاس ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ ایک میز درمیان میں اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ پردے کے دونوں طرف بیٹھنے والے اُسے استعمال کر سکیں میز کے پایوں کے بیچ سے دوسری طرف کا فرش دِکھائی پڑ رہا تھا۔

کُرسی سرکا کر بیٹھا ہی تھا کہ نقرئی گھنٹیاں ایک بار پھر بجیں۔ مجھے سلام کیا گیا تھا۔ میں عجیب سی شش و پنج میں پڑ گیا۔ ماسٹر کی حیثیت سے مجھے اُن محترمہ کو وعلیکم السلام کہنا چاہیئے یا دُعائیں دینی چاہئیں؟ کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا آخر اس حملے کو میں نے خاموشی کی ڈھال پر روکا اور حفظِ ماتقدم کے طور پر پوچھا —

"کِتنے سال فیل ہوئیں آپ میٹرک میں؟"

"چار سال —!" فخر کے ساتھ جواب دیا گیا۔

میرا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور میں دِل ہی دِل میں اُس وقت کو کوسنے لگا جب میں نے اس جگہ ٹیوشن کرنے کی حامی بھری تھی۔

"کِس مضمون میں کمزور ہیں آپ؟"

"جی! ریاضی میں ۔۔۔"

"اچھا ۔۔۔ کتاب نکالئے۔"

ایک نازک سا حسین ہاتھ، جو ریاضی کی ضخیم کتاب کے بار سے دوہرا ہوا جا رہا تھا پردے سے باہر نکلا اور کتاب میز پر میرے سامنے ڈال کر دوسرے لمحے پردے کی پشت پر اس طرح غائب ہو گیا جیسے کبوتر کابک میں دبک جاتے ہیں۔ مجھے بہت رحم آیا۔ بیچاری یہ ۔۔۔ جس کا ہاتھ کتاب کے بار کو برداشت نہیں کر سکتا بھلا اس کا دماغ کس طرح اس بار کا متحمل ہو سکتا ہے۔؟

کتاب کھول کر دیکھی۔ نہایت معمولی سوالات تھے۔ جن کے جواب میں زبانی دے سکتا تھا۔ لیکن جب انہیں سمجھانے بیٹھا۔ تب معلوم ہوا کہ سوالات حد درجہ دقیق اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ ایک ایک سوال پر کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ تب جا کر میری شاگرد انھیں سمجھ پاتی تھی۔

"کہیے ۔۔۔ یہ قاعدہ تو اچھی طرح سمجھ گئیں نا آپ؟"

"جی ہاں ۔۔۔ اچھی طرح۔"

"اچھا تو یہ بائیسواں سوال حل کیجئے۔" میں نے کتاب پردے کے دوسری طرف داخل کی۔ انگلیوں کو روئی کے گالوں کا سا لمس محسوس ہوا۔ کتاب میرے ہاتھ سے لے لی گئی۔

پانچ منٹ بیتے۔

دس منٹ گزر گئے۔

پھر پانچ منٹ اور۔

کلاک نے ٹن سے آدھ گھنٹہ بجایا۔ آخر کار پوچھنا ہی پڑا ۔۔۔

"آپ سے ابتک سوال حل نہیں ہوا؟"

"جی — دیکھئے کوشش کر رہے ہیں —" جیسے مجھ پر احسان کیا جا رہا ہو۔

"کس قاعدے سے کر رہی ہیں آپ ؟"

"جی قاعدہ —؟ دیکھئے وہ تو ہم بھول گئے !" انھوں نے ٹھٹکتے ہوئے کہا۔

"لائیے نوٹ بک مجھے دیجئے —" میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہو گئی۔

پانچ منٹ اور گزر جانے کے بعد —

"محترمہ ! میں نے نوٹ بک مانگی تھی۔"

پھر وہی خوبصورت ہاتھ میز پر نوٹ بک ڈال کر غائب ہو گیا۔ اُف میرے خدا ! ——

اس ظالم نے سوال حل کرنے کی بجائے نوٹ بک پر کسی برِاعظم کا نقشہ تیار کر ڈالا تھا۔ جھنجھلا کر میں نے نوٹ بک زور سے میز پر پٹک دی اور وہ چمکدار چکنی میز پر پھسلتی ہوئی پردے کے دوسری طرف زمین پر جا رہی۔

میز کے پایوں کے درمیان سے میں نے دیکھا۔ ایک حد درجہ حسین، چھریرے بدن کی لڑکی جھکی ہوئی نوٹ بک اٹھا رہی تھی۔ جیسے ... جیسے ... کیا بتاؤں — معلوم ہوتا تھا گلاب کے پھول پر چاند کی کرنیں رقص کر رہی ہوں۔ !

اور پھر نہ جانے کیسے اس کی نظریں میری نظروں سے ٹکرا گئیں اور میرے دل نے کسی غیر مرئی لے پر رقص کرنا شروع کر دیا اور میں جیسے قوسِ قزح کے اس پار پہنچ گیا۔

چہرہ دوبارہ پردے کی اوٹ میں ہو گیا اور میں خوابوں کی دنیا سے حقیقی دنیا میں لوٹ آیا۔ ——

"ماسٹر صاحب ! یہ سوال ایک بار پھر سمجھا دیجئے۔"

وہی معمولی سا سوال اس بار خود میری سمجھ میں بڑی مشکل سے آیا ! نہایت ہی

نرم لہجے میں وہ سوال دوبارہ سمجھا کر نوٹ بک اندر داخل کی۔ نہ جانے کس انجان توجہ نے مجھے دم آگسایا۔ ہاتھ جھک کر ترچھا ہو گیا۔ نوٹ بک پھڑپھڑاتی ہوئی فرش پر جا پڑی۔ میرے دل میں ہوس اور ضمیر کے مابین جنگ شروع ہو گئی۔ ہوس — جو دشواریوں کو آساں کر دیتی ہے — ضمیر، جو انسان کو خواہشوں اور ارادوں کی تکمیل سے روکتا ہے۔

ہوس — جیسے خدا نے دل میں اتارا ہے۔

ضمیر — جس کا قیام دماغ میں رہتا ہے۔

لیکن اس حسین و جمیل چہرے کی جھلک دوبارہ نظر آنے سے قبل ہی ضمیر ہوس پر غالب آ چکا تھا۔ میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا!

پھر میں سوال سمجھاتا رہا۔ سود کے سوال۔ رقبہ کے سوال۔ نسبت کے سوال نفع و نقصان کے سوال۔

نوٹ بک زمین پر گرتی رہی۔ زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی رہی اور جب کبھی وہ اسے اٹھانے کے لئے جھکتی رہیں گردن اٹھا کر دیوار پر آویزاں تصویروں کو دیکھنے لگتا ——

کامنی کوشل، دلیپ کی آغوش میں سسک رہی تھی۔

مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔

راج اور نرگس کے ہونٹوں کے درمیان محض ایک انچ حائل تھا۔

پر پھیلا کر دو کبوتر چونچ ملائے بیٹھے تھے اور ڈالیوں کے پیچھے چاند چمک رہا تھا وہ نوٹ بک لیتے ہوئے زمین پر گراتی رہی اور میں تصویریں دیکھتا رہا!

اور یہ سب کچھ اس وقت تک ہوتا رہا جب تک کلاک نے دس نہ بجا دیئے۔ متعینہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اسے دوسرے دن کا کام بتایا اور زینے سے اتر کر

صحن میں آگیا۔ ایک تنومند بڑی بی مصالے پیس رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی جھپاک سے اُٹھیں اور بطخ کی سی چال چلتی ہوئی باورچی خانے میں اوجھل ہوگئیں۔

میں سڑک پر آگیا۔

"لڑکی! ماسٹر صاحب اُترے تھے تو تو نے آواز کیوں نہیں دی؟" بڑی بی کی پاٹ دار آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میرے قدم ڈھیلے پڑ گئے۔

دھیمی ہنسی کی نقرئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ جیسے کسی نے رس گھول دیا ہو اور پھر ــــــ

"امّی! ــــ پردہ ہم کس سے کریں جب مرد ہی ...."

میں نے جھنجھلا کر سامنے پڑے ہوئے روڑے پر زور کی ٹھوکر لگائی اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔

اور اب دس ماہ بعد ــــــ

امتحانات جاری ہیں لیکن میری شاگرد اُن میں شریک نہیں۔ وہ اپنی کسی خفیہ بیماری کا علاج کرانے کے لئے اپنے ماموں کے ہاں دہلی گئی ہوئی ہے!!!

(فروری سنہ ۵۳ء)

نہلے پر دہلا

ہم نے اخراجات کا گوشوارہ اور معائنے کی رپورٹ جاگیردار صاحب کے سامنے رکھی تو فرطِ حیرت سے اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

لیکن ٹھیریئے۔

اصل قصّہ یوں نہیں یوں شروع ہوتا ہے کہ ہم جو کبھی جاگیردار کے زمانۂ عروج میں اُن کے مصاحب خاص تھے اور خاتمۂ جاگیرداری کے بعد اُن کے شناسا محض کی صورت اختیار کر چکے تھے (کیونکہ جب جاگیردار ہی پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا ٹھیکیدار ہو کر رہ جائے تو مصاحب خاص کا شناسا محض ہو جانا ہی بہتر ہوتا ہے) برسبیلِ تذکرہ انہیں وہ قصّہ سُنا بیٹھے جب ہمارے بہنوئی کو ہماری کارگزاری کی بدولت ایک انسپکٹر کے ظالمانہ چنگل سے رہائی نصیب ہوئی تھی۔

وہ قصّہ کچھ یوں تھا کہ بہنوئی صاحب لیٹن کے ایجنٹ تھے اور اُن کے ڈپو کی

جیک جیک گئے۔ لیکے کوئی انسپکٹر صاحب نازل ہو گئے تھے۔ ایجنٹ بیچارے زبانی جمع خرچ زیادہ اور کاغذی کارروائی کچھ مناسب سی ہی جانتے تھے۔ چنانچہ انسپکٹر موصوف نے انھیں خاصہ رگیدا۔ پھر یوں ہی نہیں کہ معاملہ صرف دفتر تک ہی محدود رہا ہو۔ بات سننے والا معقول ہاتھ لگا تھا۔ چنانچہ انسپکٹر صاحب نے انھیں فیلڈ ورک کے متعلق ہدایات دینے کا فیصلہ کیا۔ طے یہ پایا کہ دوسرے دن انسپکٹر صاحب ایجنٹ صاحب کی معیت میں بازار تشریف لے جائیں گے اور انھیں گاہکوں سے برتاؤ کرنے کے رمز سے آگاہ فرمائیں گے۔ معاملہ اس اسٹیج پر تھا کہ ہمشیرہ محترمہ کی زبانی ہمیں بھنک ملی کہ کوئی نگوڑ مارا انسپکٹر اُن کے "اُن" کو تنگ کئے ہے اور اب دوکانداروں کے سامنے کل "اُن" کی بھد اڑائے گا۔ چنانچہ ہم نے بھی کل پُرزے تیز کئے اور تیار ہو کر بیٹھ رہے۔ دوسرے دن جب انسپکٹر صاحب ایجنٹ کے ساتھ نکلے تو ہم نے چوراہے پر روک لیا اور سوا پانچ آنے کی جگہ ساڑھے تین آنے اُن کے ہاتھ میں تھما کر چائے کی ایک پُڑیا طلب کی تو انھوں نے مسکرا کر غالباً ہمارے تعلیم یافتہ نظر آنے اور کمپنی کے ایک بھاؤ کی پالیسی پر کچھ تبصرہ فرمانا چاہا تھا کہ ہم اُن کا گریبان تھام بیٹھے کیونکہ ہماری ذاتیات کا چائے کی پُڑیا سے ناجائز تعلق پیدا کیا گیا تھا۔ مختصراً یہ کہ بہنوئی صاحب نے بیچ بچاؤ کیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ انسپکٹر صاحب اس شہر میں غنڈہ گردی کی شکایت کرتے ہوئے اپنا معائنہ اُسی دن ختم کر کے مرکزی دفتر کو سدھارے!

ہم سے یہ قصہ سن کر جاگیردار رتن کمار صاحب کی تو آنکھیں ہی پھیل گئیں۔ کہنے لگے ——

"بھئی تم آدمی کام کے ہو۔ میں جاگیرداری کے زمانے سے ہی جانتا ہوں۔ اب وہ دور تو نہیں رہا کہ تمہیں مستقل تنخواہ پر اپنے ہاں رکھ سکوں۔ لیکن اگر اس قسم کا کام جیسا تم نے اپنی بہنوئی کا نکالا تھا، ہمارا بھی بنا دو تو پانچ سو روپے ہم تمہیں دیتے ہیں؟"

"جی روپے کی تو کوئی بات نہیں۔ اب بھی نام دلالی کا ہے لیکن دیا آپ ہی کا کھاتے ہیں ــــــــ"

"تو پھر ہمارا کام؟"

"لیکن حضور میرے! کام کیا ہے؟"

انھوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ کچھ حسب ذیل قسم کا نوٹس تھا ــــــــ

شری رتن کمار

ٹھیکیدار پی۔ ڈبلیو۔ ڈی

اطلاع ملی ہے کہ تمھارے ذریعہ محکمہ لہٰذا نے گولار ندی پر جو پُل تعمیر کرایا ہے اس کے درمیانی حصے میں کچھ نقص ہے۔ معائنے کے لئے شری این۔ کے۔ سیٹھی ایگزیکیوٹیو انجینیر مورخہ پندرہ جون کو موقع پر پہنچ رہے ہیں۔ آپ یا آپ کا کوئی نمائندہ بوقتِ معائنہ پُل مذکورہ پر موجود ہونا چاہیئے تاکہ تفتیش میں غیر ضروری تاخیر نہ ہو۔

دستخط

چیف ایگزیکٹوٹیو انجینیر

ہم مندرجہ بالا مراسلہ پڑھ کر بڑے فنکارانہ انداز میں مسکرائے۔ جاگیردار صاحب نے غالباً مطلب غلط لیا اور جلدی سے بولے ــــ

"بات یہ ہے کہ پُل واقعی بڑی رواداری میں بنایا گیا ہے۔ میں نے بھائی صاحب کو سمجھا دیا تھا کہ پچیس فی صدی بچت کافی ہے لیکن انھوں نے تو تخمینے سے نصف میں کام نکالنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اُدھر اپنے مقابلے میں نئے نئے ٹرسٹ پُونجیے کھڑے ہو گئے ہیں۔ ایک وہ ٹھیکیدار ہنومت سنگھ ہی ہے جس کی بابت مجھے یقین ہے کہ ٹھیکہ اپنے نام منتقل کرانے کی فکر میں ہے۔ یہ اطلاع محکمہ کو اُسی نے دی ہے ــــ"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے ؟" ——— ہم نے بدستور مسکراتے ہوئے عرض کیا ——— "یہ آپ کا ایگزیکیوٹیو انجنیئر کوئی طرم شاہ تو ہے نہیں، کہیئے تو وہیں پُل کے نیچے دفن کر دیا جائے۔"

"ارے نہیں بھئی!" جاگیردار کچھ زیادہ ہی بوکھلا گئے۔ "میرا یہ مطلب نہیں۔ اس طرح تو ٹھیکہ اور ٹھیکیدار دونوں ہی جاتے رہیں گے۔ کچھ ایسا کرو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ———"

"وہ کچھ لیتا دیتا بھی ہے" ہم نے ایک آنکھ دبا کر پوچھا۔

ٹھیکیدار صاحب رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولے ———

"یہی تو مصیبت ہے، ابھی تک کوئی ایسی اطلاع نہیں ملی کہ اس نے کہیں سے رشوت لی ہو۔ یہ آجکل کے نئے چھوکرے جو افسر ہو کر آتے ہیں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ایمانداری بگھارتے ہیں"

"خیر ——— یہ سب آپ اس خادم پر چھوڑ دیجئے ———" ہم نے قصے میں شارٹ کٹ مارتے ہوئے کہا ———

"آپ تو صاف بتلائیے کہ اگر وہ رشوت لینے پر رضامند ہو جائے تو آپ کیا دے سکیں گے اور اس سے کام کیا لینا ہوگا؟"

انھوں نے ایک جیب سے نوٹوں کی گڈی اور دوسری سے ایک نوٹ بک نکال کر میز پر ڈال دی ———

"اگر وہ اس معائنہ بک پر اپنے دستخط کے ساتھ لکھ دے کہ کام اطمینان بخش پایا گیا تو یہ دس ہزار اُس کے ———"

"ہم نے نوٹوں کا بنڈل اور معائنہ بک اپنے قبضے میں کرتے ہوئے کہا ———

"آپ کو صرف اتنا ہی سرٹیفکٹ اس معائنہ بک پر چاہیئے نا ——— ؟"

"بس - بس - صرف اِتنا ہی —"

"اور اس کے لئے آپ اُسے دس ہزار دیں گے ؟"

"اگر کچھ کم ہیں کام نِکل جائے تو ٹھیک ہی ہے —" وہ کچھ لالچ میں پڑ گئے "ورنہ پھر دس ہزار ہی سہی"

"اور اگر وہ ایک بار مُعائنہ بُک پر لکھ دینے کے بعد پھر بدل جائے" ہم نے جرح کی۔

"وہ سب ہم دیکھ لیں گے — ایک بار اِتنا ہو جائے تو پھر کوئی دِقّت نہیں رہے گی۔"

"آپ کو خادم پر بھروسہ ہے نا — ؟" ہم نے پوچھا۔

اُنھوں نے بڑے سرپرستانہ انداز میں ہماری پیٹھ پر تھپکی دی اور بولے — "پیسوں کے بارے میں تم پر بھروسہ ہے کہ درمیان میں کوئی گڑبڑ نہ ہوگی۔ لیکن کام ہو جانا چاہیئے۔"

"ہو جائے گا —" ہم نے دعویٰ کیا — "ممکن ہوا تو اس دس ہزار میں بھی بچت کی صُورت نکال لی جائے گی۔ لیکن ساتھ ہی دو چار غنڈوں کے اخراجات بھی آپ کو برداشت کرنے ہونگے۔"

"بالکل بالکل — لیکن ایسی کوئی بات نہ ہو کہ ہم لوگوں پر آنچ آئے۔" انھوں نے برجستہ فرمایا۔

"آپ مُطمئن رہیئے —" ہم نے انھیں جواب دیا۔

اور پھر اس مہم سے نمٹنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

تاریخِ مقررہ پر ہم اپنے چھ جوانوں کے ساتھ ایک جیب میں دس ہزار کی گڈی اور

دوسری میں معائنہ چیک اور ایجنٹ نامہ لئے ہوئے کولارندی کے اس پُل پر پہنچ گئے۔ جگہ کافی سنسان تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک مسافر لاری صبح اس پل سے گذر کر ہمارے شہر کی طرف جاتی تھی اور شام کو پلٹتے ہوئے اس پر سے گذرتی تھی۔ لہٰذا اس طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ ہمیں مشتبہ حالت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ صبح جب لاری گذر چکی تو ہم لوگ جو پُل کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ باہر نکل آئے اور آفیسر مذکور کا انتظار کرنے لگے جو ٹھیک ڈیڑھ بجے جیپ سے تشریف لائے اور ٹھیکیدار کے پُل پر اُترے۔ پہلے تو ہم جیپ پر سرکاری نمبر پلیٹ کی بجائے عام نمبر دیکھ کر کھٹکے کہ کوئی شکار کا شوقین ہے لیکن پھر اُن کے پُر وقار چہرے لباس اور افسروں کی، بھتہ بنانے کے لئے نجی گاڑی استعمال کرنے کی بات کا خیال آیا۔ اس کے باوجود ہم نے آگے بڑھ کر تصدیق کر لینی مناسب سمجھی۔

"حضور کیا رام گڑھ سے تشریف لائے ہیں ؟"

"نہیں میں شام پور سے آ رہا ہوں ــــ کیوں !"

"حضور ـ آپ ـ میرا مطلب ہے آپ کرتے کیا ہیں ؟"

ہیٹ ہاتھ میں لے کر انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا ــــــ

"کیوں کیا بات ہے ــ میں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا......."

"جی ۔ کچھ بات نہیں" ہم نے اُن کا جملہ کاٹ دیا ــ "میں سمجھ گیا۔ آپ رتن کمار ٹھیکیدار کا بنوایا ہوا پل دیکھنے کے لئے تشریف لائے ہیں ہے نا ؟"

"ہاں بھئی ــ لیکن تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

ہم نے انھیں بتلایا کہ ہم سابقہ جاگیردار رتن کمار صاحب کے مصاحب خاص ہیں اور موجودہ ٹھیکیدار پی۔ ڈبلیو۔ ڈی رتن کمار کے ایجنٹ ہیں۔ ساتھ ہی ہم نے انھیں اپنا رام پوری چاقو بھی بتلایا۔ اپنے ساتھ کے پیچھے ہٹے کٹے جوان

غنڈے بتلائے ۔ بہتا ہوا دریا بتلایا، اس کی گہرائی بتلائی، سناٹے کا تذکرہ کیا،
اپنے خونخوار ہونے کا ذکر کیا، جان کی قیمت کا احساس دلایا، روپے کی اہمیت پر لیکچر
دیا اور پھر آدھ گھنٹے بعد وہ حضرت پانچ ہزار روپے لے کر جدھر سے آئے تھے سیدھے
ادھر کو سدھار گئے۔ مُعائنہ بُک پر اُنھوں نے واضح الفاظ میں سرٹیفکیٹ درج کیا
تھا کہ کولار ندی کے پُل کا کام قطعی اطمینان بخش ہے۔!

ہم نے چھ سو روپیہ جوانوں کو دے کر چلتا کیا، پانچ سو اپنے حق کے علٰحدہ
نکالے اور نہایت اطمینان داری کے ساتھ حسابات درج کئے جو کچھ اس طرح تھے۔

۱۔ اخراجات آمد و رفت معہ خوراک جوانان ــــــــــ ۷۵ روپے

۲۔ جوانوں کو حق المحنت ــــــــــ ۶۰۰ روپے

۳۔ میر بہادر خاں (خادم) کا معاوضہ ــــــــــ ۵۰۰ روپے

۴۔ آفیسر فلاں (ہم نے نام درج کرنا مُناسب نہیں سمجھا) کی نذر کئے ۔۔۔ ۵۰۰۰ روپے

جُملہ میزان ــــــــــ ۶۱۷۵ روپے

باقی ــــــــــ ۳۸۲۵ روپے

کُل رقم ــــــــــ ۱۰۰۰۰ روپے

اور اسی شام کو ہم نے باقاعدہ روپیوں کے ساتھ اخراجات کا گوشوارہ
اور مُعائنے کی رپورٹ جاگیردار صاحب کے سامنے رکھی تو فرطِ حیرت سے اُن کی آنکھیں
پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ بڑی دیر تک وہ کبھی ہمیں اور کبھی گوشوارہ اور معائنہ بُک
کو دیکھتے رہے اور ہم اس اثنا میں فخر سے سینہ پھُلائے مُسکراتے رہے۔ پھر اُنھوں
نے ڈھیرے سے روپے، گوشوارہ اور مُعائنہ بُک ایک طرف سرکا کر اپنی جیب سے

دو تار نکال کر میز پر ڈال دئے۔

پہلے کا مضمون تھا ______

رتن کمار ٹھیکیدار پی۔ ڈبلیو۔ ڈی

ناگزیر حالات کی بناء پر معائنہ کولار پل ۱۵ر جون کی بجائے ۲۵ر جون کو کیا جائے گا۔ موقعہ پر حاضر ہو۔

چیف ایگزیکیوٹو انجنیر

اور دوسرا حسب ذیل تھا۔

جاگیردار صاحب

آپ کا ایجنٹ کافی مردم شناس اور با اخلاق آدمی ہے۔

ہنومت سنگھ

چنانچہ اب ہمارے حیران ہونے کی باری تھی !

(جنوری ۶۴ء)

______

مجبوب بانہہ کٹا

موسمِ گرما کے طویل اُکتا دینے والے دن اور دو ماہ کی تعطیل!
بورڈنگ کے سارے لڑکے اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ کالج کی چہار دیواری میں وہ رنگینی جو اس سے منسوب کی جاتی ہے، قطعاً مفقود ہو چکی تھی۔ مجبوراً مجھے بھی چچا میاں کے ان خطوط پر توجّہ دینی پڑی جن میں اُنھوں نے مجھ سے بار بار دیہات چلے آنے کے لئے اصرار کیا تھا اور میں نے اپنی فرمانبرداری کا سکّہ جمانے کے لئے لکھ دیا تھا کہ ازحد مصروفیت کے باوجود محض اُن کی خوشنودیٔ خاطر کے لئے میں منگل کو گاؤں پہنچ رہا ہوں۔
ٹرین سے اُترا تو پلیٹ فارم پر چچا میاں ایک نوجوان دیہاتی کے ساتھ میرے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی دوڑ کر مجھے سینے سے لپٹا لیا اور بولے ——
"بہت نٹ کھٹ ہو گئے ہو برخوردار! دو ماہ کی چھٹیوں میں بھی تمھاری مصروفیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ گھر آنے سے ہچکچاتے تھے ——"
میں مُسکرا کر چُپ ہو رہا۔ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا؟

انھوں نے اپنے ہمراہی نوجوان سے کہا ـــــــ

"محبوب! سوٹ کیس لے لو ــــ چلیں۔"

اُس نے لپک کر سوٹ کیس اُٹھا لیا اور ہمارا مختصر سا قافلہ اسٹیشن کی حدود سے باہر آ کر گاؤں جانے والی لمبی سُنسان پگڈنڈی پر ہو لیا۔ میں نے آگے چلتے ہوئے اپنے بچپن کے ساتھی محبوب کو دیکھا۔ اُس کا بدن ویسا ہی بیڈول تھا جیسا بچپن میں ــــ شباب نے اس کی بدصورتی اور جسم کی بیڈھنگی ساخت میں کوئی تغیر نہیں پیدا کیا تھا۔ ہاں بچپن میں اس کا پیٹ آگے نِکلا ہوا تھا۔ لیکن اب اندر گھُسا ہوا تھا۔ لمبا خوب ہو گیا تھا، تقریباً پونے چھ فیٹ۔ لیکن عرض بعینہٖ اُتنا ہی تھا جتنا میں نے دس سال پہلے دیکھا تھا۔ چہرے پر وہی معصومیت اور بھولا پن اب بھی برس رہا تھا۔ جس کا سہارا لے کر ہم جولی کھیلوں میں ہمیشہ اُسے بیوقوف بنایا کرتے تھے۔ گھروندے بناتے ہوئے ہم لوگ ہمیشہ پتھر مٹی وغیرہ اُسی سے اُٹھواتے تھے۔ اگر کھیل کے دوران میں گیند یا گلی کسی نالی میں چلی جاتی تو اُسے نکالنے کا فرض محبوب کو سونپا جاتا۔ پہیلیاں بُوجھنے میں اگر کوئی لڑکا مات کھا جاتا تو محبوب اُس کی جگہ جیتنے والے لڑکے کا گھوڑا بننے پر بخوشی آمادہ ہو جاتا۔ غرض یہ کہ ہمیں اپنے کھیلوں میں محبوب کی وجہ سے کافی سہولت مِلتی تھی اور جس دِن محبوب کا بوڑھا باپ زبردستی پکڑ کر اُس کا سر اُسترے سے گھٹوا دیتا، وہ دِن ہم لوگوں کے لئے بڑی تفریح کا ہوتا تھا! ـــــــ

"محبوب! آؤ پنچایت کا کھیل کھیلیں!" ہم میں سے کوئی لڑکا کہتا۔

"چلو ـــ" وہ حسبِ معمول رضامند ہو جاتا۔

"سرپنچ جانتے ہو کسے کہتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم!" اُس کا جواب ہوتا۔ حالانکہ کئی بار پہلے وہ ہمارے کھیلوں میں سرپنچ بن چُکا ہوتا۔

"پنچوں کے سردار کو سرپنچ کہتے ہیں۔" ہم اُسے بتلاتے۔

"بنو گے سرپنچ ــــ؟" کوئی ورغلاتا۔

اور وہ جاری پیشکش قبول کر لیتا۔ پھر اس کی آنکھیں بند کر کے ساری پنچایت سرپنچ کے سر کو پنچوں کا حق سمجھ کر اس کی گھٹی ہوئی چکنی چکنی چیت گاہ پر چیت جماتی، اور وہ سرپنچ بنا چپتیں وصول کرتا رہتا۔ حتیٰ کہ اس کھیل سے تنگ آ کر ہم کوئی دوسرا کھیل کھیلنے لگتے۔

اور اب وہی محبوب میرا سوٹ کیس لے کر چل رہا تھا۔ میری نگاہیں ایک بار پھر اُس کے بیڈول جسم کا جائزہ لینے لگیں۔ اُس کا سر اب بھی اُسترے سے گھٹا ہوا تھا۔ لیکن اب اُس بے ڈھنگوں کے پروں جیسی سپید بے داغ گاندھی ٹوپی بھی لگا رکھی تھی۔ میلی جیکٹ نیکر کی جگہ ایک گاڑھے کی دھوتی نے لے رکھی تھی جو ٹوپی ہی کی طرح بے داغ، اُجلی اور بے شکن تھی البتہ قمیص کئی جگہ سے پھٹی ہوئی اور میلی تھی اور اس پر جگہ جگہ تیل کے بدنما دھبے نمایاں تھے۔

صاف ظاہر تھا کہ میرے بچپن کا لنگوٹیا یار اب تک اپنے دماغ کے ڈھیلے پُرزوں کو کس نہیں پایا تھا! میں نے موٹے تلے کے کریپ سول جوتے پہن رکھے تھے لیکن پیر تھے کہ آگ کی طرح جل رہے تھے۔ چچا میاں بار بار اپنا چھاتا مجھ پر اس طرح جُھکا دیتے تھے۔ جیسے اُنھیں دھوپ کی چنداں پروا نہ ہو لیکن چند لمحوں بعد ہی دھوپ کی حدت اُن کا ہاتھ سیدھا کر دیتی تھی اور میں پسینہ پونچھ کر ان سے اس طرح سٹ کر چلنے لگتا تھا۔ جیسے مجھے اُن سے بہت زیادہ محبت ہو حالانکہ اس طرح میں اُس محدود سائے کی پناہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جو چھاتے کی محبت میں اسٹیشن سے ہمارے ساتھ لگا چلا آتا تھا ــــ لیکن مجبوب ــــ؟ چلچلاتی دھوپ میں شعلوں کی سی تمتماہٹ رکھنے والی آفتاب کی سیدھی سُرخ شعاعوں سے بے نیاز تپتی ہوئی ریتیلی زمین پر ننگے پاؤں ٹوٹے کیس لئے ہوئے اس اطمینان کے ساتھ چل رہا تھا۔ جیسے وہ تپتی ہوئی ریتیلی ریت نہ ہو کسی پُر فضا باغ کی ٹھنڈی روِش ہو، وہ سورج کی تند شعاعیں نہ ہوں بلکہ نرم و لطیف پھوہاریں ہوں اور لُو کے جھکڑوں کی جگہ جانفزا بادِ نسیم

اٹکھیلیاں کر رہی ہو!

میں اسی طرح ماضی اور حال کے عمیق سمندروں میں غوطے کھاتا رہا اور پھر نہ جانے کب گھر آگیا۔ وہاں ماں کی ماتا، بہنوں کی محبت اور اعزا کی شفقتوں میں میں محبوب کو بھول سا گیا۔ وہ دن احباب واقارب سے ملاقاتوں اور آپ بیتیاں سُنانے اور جگ بیتیاں سُننے میں بیت گیا۔

دوسرے دن قدرے سکون نصیب ہوا تو سوچا کچھ مطالعہ ہی کر ڈالوں۔ گزشتہ امتحان میں سائنس میں میرے نمبر اطمینان بخش نہیں تھے اور میں اس سال کی یہ کمی دور کر ڈالنا چاہتا تھا۔ نرگس کے فارمولے دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے آواز دی باہر نکل کر دیکھا تو محبوب تھا۔ کچھ تعجب سا ہوا ۔۔

"کیوں محبوب! کیا بات ہے ؟"

وہ سٹپٹایا ہوا سا تھا۔ کہنے لگا ——

"کل چچا میاں کے سامنے آپ سے کوئی بات نہیں ہو سکی —— آپ اچھے تو ہیں ؟"

میں کھلکھلا کر ہنسا ——

"اچھا نہ ہوتا تو یہاں کس طرح آتا بھائی !"

وہ جھینپ سا گیا اور اپنی میلی قمیص کا دامن دانتوں سے چبانے لگا۔ یہ اُس کی بچپن کی عادت تھی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ میں نے پوچھا ——

"تم کیسے رہے محبوب !؟"

"جی اچھا ہوں —— پرسوں البتہ بخار آگیا تھا۔"

میں نے بمشکل ہنسی ضبط کی اور پھر جب دیکھا کہ وہ خاموش کھڑا ہے تو واپس جانے کے لئے مڑا کہ ——

"بابو جی ــــ !"

میں رُک کر بولا ــــ

"کہو ــــ ؟"

قمیص کا دامن چباتے ہوئے اُس نے کہا ــــ

"آپ کو انگریزی آتی ہے ؟"

"تو کیا کالج میں اجاڑ بھونکا کرتا ہوں ــــ کچھ کام ہے کیا ؟"

"مجھے محبوب کی انگریزی بتلا دیجئے ــــ !"

"نان سنس !"

میں اس کی بکواس سے اُکتا کر اندر چلا گیا فارم جو بھرنے تھے۔

دوسرے دن پوسٹ آفس سے ٹکٹ منگوانے تھے۔ میں محبوب کی کوٹھری کی طرف گیا۔ وہ تو دکھلائی نہیں دیا، اس کا بوڑھا باپ برتن مانجھ رہا تھا۔ اسی سے پوچھا۔

"محبوب کہاں ہے ؟"

بوڑھے نے کوٹھری کی طرف اشارہ کیا اور پکارا ــــ

"محبوب ــــ !"

اندر سے کسی کے غرانے کی آواز آئی۔ بوڑھے نے پھر پکارا ــــ

"محبوب ! دیکھ بابو جی بُلا رہے ہیں ــــ"

وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا ــــ

"ابا کل سے کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ محبوب کو انگریزی میں نان سنس کہتے ہیں۔ مجھے نان سنس کہا کرو ــــ !"

مجھے دیکھ کر وہ بوکھلا سا گیا اور قمیص کا دامن چباتے ہوئے کھڑا ہو گیا

اس بار مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ——

”تمہیں انگریزی سیکھنے کا بہت شوق ہے شاید؟“

اس کے بوڑھے باپ نے بات کاٹی اور توا ہاتھ سے پٹک کر بولا ——

”شوق کیا ہے بابوجی! پاگل پن ہے۔ اسکول میں نام لکھوا دیا تھا۔ چھٹی کلاس میں تین سال فیل ہوا اور پھر چھوڑ دیا۔ اب آپ کو دیکھ کر انگریزی پڑھنے کا شوق چرایا ہے۔“

میں نے اسے پیسے دیتے ہوئے کہا ——

”ذرا پوسٹ آفس سے دس پیسے والے ٹکٹ لے آؤ۔ اور ہاں روزانہ شام کو مجھ سے تھوڑی دیر پڑھ لیا کرو۔ میرے یہاں رہنے تک تھوڑی بہت انگریزی سیکھ ہی جاؤ گے۔“

وہ تیز تیز بے ڈھنگی چال چلتا ہوا پوسٹ آفس چلا گیا۔

اسی دن شام کو وہ نوٹ بک اور پنسل لیے ہوئے میری جان کھانے آ گیا۔ میں نے اسے انگریزی کے حروف لکھ کر دے دیئے اور دوسرے دن یاد کر کے سنانے کو کہا۔ دوسرے دن صبح چہل قدمی کرتے ہوئے محبوب کی کوٹھری کی طرف سے گزرا تو اس کا بوڑھا باپ صحن میں جھاڑو دیتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

”اب بس بھی کر خدا کے بندے! رات بھر تو رٹتا رہا ہے۔ غضب خدا کا۔ اتنی سخت گرمی میں پوری رات بھر چراغ لئے کوٹھری کا دروازہ بند کر کے اندر۔ اے۔ بی۔ سی۔ ڈی رٹتا رہا۔ چل اب بس کر صبح ہو گئی۔ چکی پر جا کر باجرا پسوا لا، ورنہ روٹی نہیں پکے گی —— سنتا کہ نہیں ——“

اور وہ کانوں میں تیل ڈالے اندر بیٹھا اپنا سبق یاد کرتا رہا۔ تیز تیز آواز کے ساتھ ”ای۔ ایف۔ جی۔ ایچ۔ آئی۔ جے ....“

میں چپ چاپ وہاں سے کھسک آیا۔ اگر اس کا باپ مجھے دیکھ لیتا تو ضرور اس کی شکایت مجھ سے کرتا اور میں محبوب کی راہ شوق کا روڑہ بننا نہیں چاہتا تھا۔

اُسی دن شام کو وہ منہ لٹکائے میرے پاس آیا۔ میں نے سبق سُنا۔ بغیر سانس لئے ہوئے اُسنے تیزی سے رٹتے ہوئے الفاظ طوطے کی طرح دُہرا دیئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُس نے صرف یاد کیا ہے حروف بالکل نہیں پہچانتا۔ حد یہ کہ 'اے' کو 'کے' بتلاتا تھا اور ایل کو بھی ——!

اُس دن میں نے اُسے کوئی سبق نہ دیا بلکہ دوسرے دن کاپی لکھنے کا کام دیا۔ چھٹی دے کر کھڑا ہوا تو اُس نے کہا ——

"بابوجی ——!"

میں اُس کا منہ دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر تک دانتوں سے قمیص کا دامن چبانے کے بعد اُس نے کہا ——

"میں نہیں لکھوں گا۔ شرم آتی ہے۔"

میں سمجھ گیا۔ وہ بھوکا تھا۔ صبح باپ نے اُسے باجرا پیسا کر لانے کو کہا تھا اور وہ نہیں گیا تھا اور دونوں باپ بیٹے ضد میں بھوکے بیٹھے رہے تھے۔ گھر میں کوئی تیسرا فرد نہیں ہوتا تھا جو اُنہیں مناتا کیوں کہ محبوب کی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کو بچپن میں ہی ممتا سے محروم کر گئی تھی —— میں نے گھر لے جا کر اُسے کھانا کھلانا چاہا لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔

"نہیں بابوجی! ابا ناراض ہونگے ——"

اور مجھے اس کے باپ کو بھی منانے اور کھانا کھلانے کی ذمہ داری اپنے سر لینی پڑی۔

ایک اور دن وہ پڑھنے آیا تو دیکھا کہ خلافِ دستور ایک صاف دُھلی ہوئی کلف شدہ قمیص پہنے تھا لیکن دھوتی میلی اور پھٹی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا ——

"محبوب! تمہاری یہ کیا عادت ہے؟ اگر قمیص صاف پہنتے ہو تو دھوتی میلی

جوتی ہے اور اگر صاف دھوتی پہنتے ہو تو قمیص گندی لٹکا آتے ہو ۔۔۔؟"

اُس کی منطق نرالی تھی ۔۔۔

"پھٹے ہوئے کپڑوں کو تو دھوبی نیا نہیں کر سکتا اس لئے میں اُن پر پیسے ضائع نہیں کرتا۔ اچھے کپڑے دُھلنے کے لئے دے دیتا ہوں اور بوسیدہ کپڑے ویسے ہی پہن لیتا ہوں!"

میں بھلا ایسے فلسفی کو کیا سمجھا سکتا تھا؟!

میری چھٹیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں اور محبوب کا شوق روز افزوں ترقی پر تھا۔ اتنے ہی دنوں میں اُس نے اتنے انگریزی الفاظ ازبر کر لئے تھے کہ اس کا ذخیرۂ الفاظ میرے ذخیرے سے کسی صورت کم نہ ہوگا۔ اگر میں کوئی چیز اُس سے منگواتا تو وہ فوراً اس کی انگریزی مجھ سے دریافت کرتا ۔۔۔

"محبوب ذرا پنساری کے ہاں سے ہلدی تو لا دو ۔۔۔"

"پنساری کی انگریزی بتایئے پہلے؟"

اور بتلا دو تو ۔۔۔

"ہلدی کی بھی ۔۔۔؟"

دماغ کے کسی کونے میں مجھے ہلدی کی انگریزی بھی تلاش کرنی پڑتی۔ وہ بازار سے سودا خرید کر پلٹتا تو میرے لئے بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا ۔۔۔

"بابوجی! تربوز کو کیا کہتے ہیں انگلش میں؟"

"اور خربوزے کو؟"

"اور ککڑی کو؟"

میں کچھ اپنے حافظے کی مدد سے کچھ لغت میں تلاش کر کے مطلوبہ الفاظ کے انگریزی معنے اُسے لکھوا دیتا۔ امی کھانا لا کر سامنے رکھتیں اور پہلا ہی لقمہ ہی اُٹھاتا کہ دروازے پر زنجیر کھڑکتی اور ۔۔۔

"بابوجی ــــــــ!"

خدا تیرا بیڑا غرق کرے۔ مجبوراً باہر آتا اور قہر آلود نگاہوں سے محبوب کو دامن چباتے ہوئے دیکھتا ــ

"صرف ایک بات بتا دیجئے ــ"

"پوچھو ــ!"

"میٹھی رساں کو فو پوسٹمین کہتے ہیں نا؟"

"ہاں پھر......؟"

"لیکن اپنے ہاں کے چھٹی رساں کو تو میٹری لعل کہتے ہیں!"

"آخر تمھارا مطلب کیا ہے؟"

"میٹری لعل کی انگریزی؟"

"نان سنس!" میں اُکتا کر کہتا لیکن وائے مصیبت۔ وہ دامنگیر ہو جاتا ــ

"نان سنس تو آپ نے محبوب کی انگریزی بتائی تھی ــ؟"

"ارے بھائی! نان سنس تو ناسمجھ کو کہتے ہیں۔ انگریزی میں محبوب اور میٹری لعل کو محبوب اور میٹری لعل ہی کہیں گے۔"

"لیکن میں نے تو کسی انگریز کا نام میٹری لعل یا محبوب نہیں پڑھا نہ کہیں سُننے میں آیا ــ"

"میرے یار! ولایت میں ایسے نام نہیں رکھے جاتے"

"اور اگر ہم لوگ ولایت پہنچ جائیں تو ــ؟"

میں زچ ہو کر دِسے باہر کھڑا چھوڑ کر اندر چلا جاتا ــ

لیکن لطف تو یہ تھا کہ اتنے الفاظ اور معنے رٹنے کے باوجود بھی کوئی ایک جملہ بھی انگریزی میں نہیں بول سکتا تھا۔ انگریزی میں زمین کو کیا کہتے ہیں اور آسمان کو اور

جنت کو اور دوزخ کو .... آپ پوچھتے جایئے وہ سب کی انگلش بتلا سکتا تھا لیکن آپ اس سے کوئی ایک جملہ انگریزی کا پوچھئے تو وہ جواب نہ دے پاتا۔ جواب دیتا بھی کیسے جب اُسے وہ جملہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ صرف سر ہلا دینے پر اکتفا کر لیتا تھا ــــــ

"محبوب تم نے کھانا کھایا ؟"

وہ سر ہلا دیتا۔

"تمہارا باپ کہاں ہے ؟" انگریزی میں اس سے سوال ہوتا۔

"یس ــ !" وہ بغیر سمجھے ہوئے سر ہلا کر زوردار لہجے میں کہتا۔

"تم کل کہاں گئے تھے ؟"

وہ گدھے کی طرح سر ہلا دیتا۔ !

ایک مزیدار بات اور بھی تھی ــــ اگر اُس کا نام پوچھا جاتا تو وہ سوال کرتا ــــ

"اُردو نام یا انگلش ــ ؟"

"پہلے اُردو بتاؤ ــ ؟"

"محبوب باٹھ کشا ــــ !"

"اب انگریزی......"

وہ میرے بتلائے ہوئے الفاظ طوطے کی طرح دُہرا دیتا۔

"مسٹر ایم۔ شاہ !"

حالانکہ نان سنس کی جگہ مسٹر ایم۔ شاہ رٹانے میں مجھے اُس کے ساتھ کافی مغز پچی کرنی پڑی تھی۔

اور پھر چھٹیاں ختم ہونے کے بعد کچھ دن پہلے میرے بچپن کے دو تین دوست اور آگئے جو باہر دوسرے شہروں میں پڑھتے تھے۔ دو ایک شامیں مجھے اُن کی صحبت میں بھی گذارنی

پڑیں ـــــــ

معین نے پوچھا ـــ

"مظفر صاحب! سُنا ہے آپ افسانے خوب لکھتے ہیں؟"

"ہاں کچھ یوں ہی کاغذ سیاہ کر لیتا ہوں۔"

"لیکن سُنا ہے ان میں رومانس بالکل نہیں ہوتا۔"

وہ براہِ راست جملہ کسنے کی کوشش کرتا۔ اور ایک بامعنی مُسکراہٹ کے ساتھ اپنے دوسرے دوستوں کی طرف دیکھتا۔ پھر محمود کہتا ـــ

"مسٹر! آپ کس کالج میں پڑھتے ہیں؟"

میں اپنی مشہورِ زمانہ یونیورسٹی کا نام بتلا دیتا ـــ

"اور آپ قمیض پاجامہ پہنتے ہیں؟" اُس کی آنکھیں مصنوعی حیرت سے کھُلی کی کھُلی رہ جاتیں۔

"کوئی ہرج ہے ـــ؟"

"نہیں کوئی خاص نہیں ـــ" وہ کہتا ـــ "لیکن ہمارے کالج میں خاکروب بھی سُوٹ پہنتے ہیں!"

میں اُس کے سُوٹ کو مصنوعی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تاکہ وہ جی بھر کر خوش ہوے۔ اور فرسٹ ایئر میں تین سال لگاتار فیل ہونے والا محمود فخر سے اپنا سینہ پھُلا کر کبک دری بن جاتا۔ علیم اختر بھلا کیوں چوکتا ـــ

"مظفر بھائی! آجکل آپ محبوب کے ساتھ بہت رہتے ہیں؟"

"کوئی اعتراض ہے جناب کو؟"

"شاید آپ کو معلوم نہیں وہ بانہہ کٹا ہے!"

"مجھے تو اُس کی کوئی بانہہ کٹی ہوئی نہیں معلوم ہوتی!"

ایک فرمائشی قہقہے سے کمرہ گونج اٹھتا۔ مجتبیٰ میدان میں آ جاتا —

"حضرت! آپ کو افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ ہے لیکن معلومات کا یہ عالم ہے کہ فقیروں کی ذات باہنہ کوٹوں سے آپ ناواقف ہیں —؟"

"خیر! آج معلوم ہو گئی ذات بھی — بہرحال یہ تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ دیسا باہنہ کوٹا آپ سب حضرات کے ساتھ آج سے دس پندرہ سال پہلے گلی ڈنڈا اور گولیاں کھیلا کرتا تھا!"

وہ لوگ چیخ اٹھے —

"وہ بچپن کی باتیں تھیں —"

"یہ انسانیت کی باتیں ہیں —"

میں وہاں سے اٹھ آتا۔ وہ سمجھتے میں جھینپ کر بھاگ رہا ہوں اب انہیں کیا بتلاتا کہ جسے وہ اپنی لفاظیوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں وہ اپنے کالج کا تیز طرار مقرر ہے اور اُن کی گندی ذہنیت پر تقریباً تھوک کر اٹھا ہے۔

اور پھر میں مجیب کی کوٹھری میں جا کر اس ٹوٹے ہوئے ٹین کے بکس پہ بیٹھ کر جس پر اُس نے ازراہِ تعظیم ایک پھٹی ہوئی چادر بچھا رکھی تھی، اُسے دنیا بھر کی الم غلم چیزوں کی انگریزی بتاتا رہتا۔

اور چھٹیاں ختم ہو گئیں۔

یونیورسٹی اور کالج کھل چکے ہیں۔ میں اور میرے سارے کلاس فیلوز اپنے اپنے گھروں سے واپس آ چکے ہیں لیکن نہ جانے کالج کی رنگینی اب تک کیوں نہیں لوٹی ہے — کم از کم میرے لئے۔ اب پھر جبار جعفری کی پُر لطف باتیں طنز آلود معلوم ہوتی ہیں۔ ظفر احمد کی سادگی میں تصنع کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ قمر کی معصومیت کے پیچھے ریاکاری کا گھناؤنا چہرہ نظر آتا ہے۔ میں دوستوں کے دلوں میں اُتر کر خلوص کی

تلاش کرتا ہوں لیکن وہاں مکر، ریا، فریب، کینہ، بغض، خود غرضی، حسد، بناوٹ، اور خودستائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ خلوص میرے لیے صرف اُن خطوط سے فراہم ہوتا ہے جن میں نیم پاگل محبوب گپتا ہر بار یہ ضرور لکھتا ہے ——

بابوجی! آپ کب آئیں گے ؟

میں بانہہ گپتا کی انگریزی بھول گیا ہوں !

(جون ۵۴ء)

دِل اور دل

نواب صاحب کے کارخانے میں لوئر ڈویژن کلرکوں کا انتخاب ہو رہا تھا۔

"حنیف مضطر!" کمرے میں ڈائرکٹر صاحب نے لسٹ دیکھ کر اگلا نام پڑھا اور چق کے باہر کھڑے ہوئے چپراسی نے چونک کر صدا لگائی ۔۔۔

"حنیف مجسٹر!"

امیدواروں کی قطار میں ہلکی سی بھنبھناہٹ ہوئی۔ سب سے آگے کھڑے ہوئے حنیف مضطر نے جلدی سے مولوی صاحب کی ہدایت کو یاد کیا۔ مٹھی میں دبی ہوئی شکر پھانک کر جیب سے تعویذ نکالا اور ایک نظر اُسے دیکھ کر پھر جیب میں رکھ لیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

"آداب عرض ہے صاحب!" میز کے سامنے مؤدب کھڑے ہو کر اُس نے کہا سامنے بیٹھے ہوئے تین افسروں میں سے دو بُت بنے بیٹھے رہے۔ تیسرے نے جس کی ایک آنکھ بھینگی تھی۔ سر اُٹھا کر اُسے دیکھا ۔۔۔

"کیا نام ہے آپ کا ۔۔۔ ؟"

"حنیف مضطر!
"تمہیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے کام کیا خاک کروگے؟"
"جی ۔ جی ۔۔۔" حنیف مضطر نے بوکھلا کر کہا ۔۔۔ "میں سمجھا نہیں جناب!"
"جواب پورے جملے میں دینا چاہیئے ۔"
"بہتر ہے جناب ۔۔۔ اس خاکسار کو حنیف مضطر کہتے ہیں جناب!"
"کوالیفکیشن ۔۔۔؟"
"گریجویٹ ہوں سر! انگریزی میں امتیاز ...."
بات بیچ ہی میں کٹ گئی ۔ دوسرے افسر نے فائل دیکھتے ہوئے کہا ۔۔۔
"گریجویٹ تو نہیں معلوم ہوتے ورنہ اس طرح ہر بات پر "جناب" اور "سر" کہہ کر بات نہ کرتے"

حنیف نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈگری کھول کر میز پر رکھ دی، جسے کسی نے دیکھا تک نہیں ۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر بنگلے افسر نے اس کی ڈگری سیر کاتے ہوئے کہا ۔۔۔

"تم جا سکتے ہو ۔۔۔"
"کیا مجھے منتخب کر لیا گیا ہے سر!" حنیف مضطر نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دریافت کیا ۔
ڈائرکٹر نے مسکرا کر سکریٹری کی طرف دیکھا ۔ مطلب یہ کہ اس لایعنی بکواس کا جواب وہ نمٹائے ۔
"دیکھو بھئی ۔۔۔" سکریٹری نرم لہجے میں بولا ۔۔۔ "ہمارا اصول یہ ہے کہ اول تو ہم اپنی ہی ریاست کے مقامی امیدواروں کو لیتے ہیں اور اس کے بعد یو۔ پی والوں کو ترجیح دیتے ہیں ۔"

حنیف مضطر کی آنکھیں جگمگا گئیں اور دل میں آشاؤں نے ہلکورے لئے۔

"صاحب! میں نے بی۔ اے یو۔ پی سے کیا ہے ــ الہ آباد یونیورسٹی سے"

اس نے ڈگری ابھر آگے بڑھائی جو پیچھے ڈھکیل دی گئی۔

"وہاں سے بی۔ اے کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم یو۔ پی کے ہی ہو!" تیسرا

افسر بولا۔

"دیسے بھی صاحب! ابھی کل ہی ایک بنگالی کو ملازم رکھا گیا ہے۔"

صاحبزادے! تمہیں ہمارے انتظامیہ پر تنقید کے لئے نہیں طلب کیا گیا ہے۔"

ڈائرکٹر نے آنکھیں نکالیں۔

"ارے بھئی ـــ" سکریٹری نے وضاحت کی ــ "وہ ہمارے آفس کے

سپرنٹنڈنٹ کا سالا تھا۔ جنھیں یہاں کی شہریت کے حقوق حاصل ہیں۔"

"بہتر ہے صاحب! شکریہ ــ" حنیف مضطر نے اپنے کاغذات سنبھالتے ہوئے

دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔

"اُدھر نہیں مسٹر! ـــ اِدھر ـــ باہر جانے کا راستہ یہ ہے ــ" بیچ کے

افسر نے انگلی اٹھا کر رہنمائی کی اور وہ بوکھلا کر باہر نکل گیا۔ کمرہ قہقہوں سے گونج

رہا تھا۔

باہر آ کر حنیف مضطر نے تعویذ کو میکے سے چاک کر کے پھینک دیا۔ بخشش

عباس جو کھمبے سے ٹیک لگائے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے پاس لپکتا ہوا آیا

اور خانے پر ٹھونگا مارتے ہوئے بولا۔

"دیکھو بیٹا! کوئی اچھی سی خبر سنانا۔ انٹرویو میں کیا رہا!"

"پہلے اپنی کہو؟"

"جس طرف جاتا ہوں اُمید یہی کہتی ہے...." بخشش عباس نے شعر

سُنانا چاہا۔

حنیف مضطر نے دوسرا مصرع جلدی سے خود پڑھ دیا۔

"آرزو گیوں لئے آتا ہے یہاں کچھ بھی نہیں"

دونوں قہقہے لگانے لگے۔ پھر کھلے قہقہے۔

"یعنی تم کو بھی کورا جواب مل گیا۔۔۔؟" حنیف مضطر نے اچانک سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ "کیوں جوڈیشیل سکریٹری نے کیا کہا؟"

"ہاں یار۔۔۔" بخشش عباس نے جواب دیا۔ "سالے کے پاس گیا تو کہنے لگا ہمیں ایسے ماسٹر کی ضرورت ہے جو ہائر کلاسیز کو اچھی طرح ہندی پڑھا سکے۔۔۔"

"پھر تم نے ہندی میں ایم۔ اے کی ڈگری نہیں دکھلائی۔۔۔؟" حنیف نے پینی سے پوچھا۔ "دکھائی تھی بے! کیا بالکل ہی احمق سمجھتا ہے۔۔۔ کہنے لگا وہ اس شخص کو ترجیح دے گا جو ساتھ میں اُردو بھی پڑھا سکے۔۔۔"

"ابے تو پھر کیا گڑبڑ ہو گئی؟" حنیف مضطر بولا۔ "تو نے کہا نہیں کہ میں اُردو کا مانا ہوا ادیب ہوں!" "کہا تھا یار۔۔۔" بخشش عباس منہ لٹکا کر بولا۔ "وہ سالا امتحان لینے بیٹھ گیا۔ بولا بتاؤ یہ شعر کس کا ہے۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا۔

میں نے عرض کیا صاحب! یہ غالب کا ہے۔ بس بھیا۔۔۔ اتنا کہنا غضب ہو گیا سننے سے ہی اُکھڑ گیا وہ تو۔۔۔ کہنے لگا آجکل کے نوجوانوں کے سر پر تو غالب بھوت کی طرح سوار ہے۔ جہاں کوئی اچھا شعر سُنا۔ اُسے غالب سے منسوب کر دیتے ہیں۔ تم اچھے خاصے میر کے شعر کو غالب کا شعر کہہ رہے ہو۔۔۔ نکلو کمرے سے تم تو طالب علموں کی مٹی پلید کر دو گے!"

"خوب! بڑے پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں وہ تو۔۔۔ اچھا پھر کیا ہوا؟"

"پھر ہوا یہ کہ نوٹ کے بدھو گھر کو آئے ـــ" بخشش عباس منہ پچکا کر بولا۔

تبھی چپراسی آ کر دونوں کو دھکے دینے لگا۔

"ارے ـ ارے ..... ناراض کیوں ہوتے ہو بھئی!" دونوں بیک وقت چیخے۔

"صاحب ناراض ہوتے ہیں" چپراسی کڑک کر بولا ـــ "جی کے سامنے سے ہٹو!"

وہ دونوں مٹکتے ہوئے کمپاؤنڈ سے باہر نکل آئے۔

تھوڑی دیر تک سڑک پر ادھر اُدھر بھٹکتے رہنے کے بعد بخشش عباس پر سنجیدگی کا دورہ پڑا اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ـــ

"یار میں تو تنگ آ گیا ہوں اس نامراد زندگی سے۔"

"ارر ر ..... یہ کیا؟" حنیف مضطر نے اس کی پیٹھ پر دھپ مارتے ہوئے کہا۔ "تم تو کسی عاشق نامراد کی طرح ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ گرمی پہنچانی چاہیئے نہیں ـــ آؤ عیاشی کرنے چلیں!"

وہ آسے چوراہے کے سڑلی سے ریستوران میں پہنچ گیا۔ کھولتی ہوئی بودار چائے اور چار مینار سگرٹ پی کر انھوں نے آخری چونی سے عیاشی کی۔

"بیٹے! ملازمت نہایت جفا پیشہ محبوبہ ہے۔ تم ابھی سے ہمت ہار بیٹھے۔ کیا رانے صاحب مرحوم کا کہنا بھول گئے؟" حنیف نے چائے کی چھوٹی سی چسکی لیتے ہوئے کہا

"کیا کہا تھا رانے صاحب مرحوم نے مرتے وقت؟" بخشش عباس نے اس کی طرف مضحکہ خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"زندگی زندہ دلی کا نام ہے ـــ" ترنم کے ساتھ جواب ملا

"مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج ان حضرت نے بھی منہ پھاڑ دیا۔"

"غم نہ کر ـــ" حنیف مضطر نے بخشش عباس کے پھٹے ہوئے جوتوں کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ڈھارس بندھائی ـــ" ابھی میرے پاس باٹا کی ایک

چیتی نالتو پڑی ہے۔"

"لیکن بھائی! اس طرح کب تک کام چلے گا۔؟"

"ہاں یار یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟

"پھر ———؟"

"سوچو ———؟"

دونوں چارمینار سگرٹ کے کش پر کش کھینچنے لگے۔

"کیوں نہ نواب صاحب سے ملیں؟" بخشش عباس نے چٹکی بجاکر کہا۔

حنیف مضطر اچھل پڑا۔

"واہ میرے شیر — بڑی دور کی کوڑی لائے ہو — چلو چلیں —"

"ہونھ — چلو چلیں!" حنیف مضطر نے آنکھیں مٹکا کر منہ چڑایا —

"بھیّا! راجہ بھوج کا معاملہ ہے گنگو تیلی کا نہیں — پہلے فون کرکے اُن سے ملاقات

کا وقت تو لے لو —"

"بھئی جو کچھ بھی کرنا ہو جلدی کر ڈالو۔ نیک کام میں دیر نہیں کیا کرتے —"

دونوں پوسٹ آفس کے پبلک کال بکس کی طرف بھاگے۔ کیبن میں پہنچ کر حنیف مضطر

نے رسیور اٹھاکر کان سے لگایا —

"ہلو ایکسچینج!"

"اُلّو ہے احمق آدمی!" بخشش عباس رسیور چھین کر اپنے کان سے لگاتے

ہوئے بولا — "نہیں.... نہیں مس آپریٹر! احمق میں نے تمہیں نہیں اپنے ساتھی کو کہا

ہے — نمبر نہیں معلوم — ہز ہائینس سے ملا دو —"

"ساری مسٹر!" جواب ملا — "ہمارے ہاں ہز ہائی نس کے نام سے کوئی نمبر نہیں۔"

"کوئی بات نہیں — اُن کا پرائیویٹ سکریٹری سہی"

"ڈیری ڈیل — !"

دور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز بخشش عباس کے کان میں پڑی اور پھر —

"ہلو — ! ہو اسپیکس ؟"

"آپ کون ہیں ؟"

"پچھ پڑھ — پرنسپل سلطانیہ کالج —"

"اوہ معاف کیجئے گا" بخشش عباس نے ریسیور ہلاتے ہوئے معذرت

چاہی — "مجھے تو ہز ہائی نس کے پرائیویٹ سکریٹری کا نمبر چاہیے —"

"نیور مائنڈ — آپریٹر کو فائیو زیرو ملانے کے لئے کہیے —"

لائن کٹ گئی۔ بخشش عباس ایکسچینج سے کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ

حنیف مضطر نے ریسیور چھین لیا —

"اتنا بوکھلا کیوں رہے ہو؟ لائن کٹ چکی ہے۔ آپریٹر کو پھر رنگ کرو —"

دونوں نے باری باری لسٹ کا سوئچ کئی بار دبایا —

"نمبر پلیز — ؟" آپریٹر گرل کی جھنجھلائی ہوئی لہکوں میں تیری ہوئی آواز تیرتی

ہوئی آئی —

"زیرو فائیو پلیز —" حنیف مضطر نے اضطراب کے ساتھ کہا۔

چند لمحوں کی کھٹ پٹ کے بعد پھر کہیں دور گھنٹی بجی —

"ہلو — !" بہت بھاری آواز میں کوئی دوسری طرف سے بولا۔

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" حنیف نے سہم کر پوچھا۔

"کرنل قریشی — پرائیویٹ سکریٹری آف ہز ہائی نس !"

بخشش عباس نے بھی ریسیور سے کان بھڑا لئے۔

"صاحب! ہم دونوں آدمی ہز ہائی نس سے ملنا چاہتے ہیں" حنیف مضطر نے ہمت

سے کام لیا۔

"کون دو آدمی ــــ؟"

"حنیف مضطر اور بخشش عباس!"

"کس لئے ــــ؟"

"بس یوں ہی ــــ میرا مطلب ہے کہ ......" حنیف ہکلانے لگا۔

"بس یوں ہی ــــ یہ کیا جواب ہوا۔ ہز ہائی نس کو آپ نے کھلونا سمجھ رکھا ہے کیا ــــ کچھ تو مقصد ہوگا؟"

اب تک ریسیور بخشش عباس چھین چکا تھا ــــ

"جی! ہم لوگ ایک نجی کام سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کیسا نجی کام ــــ؟"

"معاف کیجئے ــــ وہ صرف ہز ہائی نس کو ہی بتایا جا سکتا ہے۔"

"معاف کیجئے۔ ملاقات کا مقصد بتائے بغیر آپ اُن سے نہیں مل سکتے!"

"میں نے عرض کیا نا ــ کہ وہ ایک نجی کام ہے اور نواب صاحب ہی کو بتایا جا سکتا ہے۔"

"میں اُنہیں کا پرائیویٹ سکریٹری ہوں۔"

"یہی تو میں بھی کہنا چاہتا ہوں ــــ" بخشش عباس جھلا کر بولا ــــ "کہ آپ محض پرائیویٹ سکریٹری ہیں"

"نواب صاحب کا پرائیویٹ سکریٹری ــــ" بہت اطمینان کے ساتھ جواب ملا۔

بخشش عباس بوکھلایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ حنیف مضطر نے ریسیور اُس سے چھین لیا

"دیکھئے صاحب! ہم لوگ ملک کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں"

"اوہ ــــ تب تو ہز ہائی نس سے آپکی ملاقات قطعاً ناممکن ہے۔"

"جی ــــ وہ کیوں!" حنیف مضطر نے گھبرا کر پوچھا۔

"خود شاعروں اور ادیبوں سے سخت نفرت کرتے ہیں!"

"کیا بات کرتے ہیں آپ بھی ۔۔" حنیف مضطر نے طنز آلودہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

"ابھی پچھلے مہینے ہی اُن کا ضخیم دیوان پنجاب گورنمنٹ نے تقسیم کیا گیا ہے ۔۔"

جواب میں ایک بھاری طنزیہ قہقہہ وصول ہوا ۔۔۔

"وہ پچھلے دور کے مختلف شاعروں سے زبردستی ہوئی تھی ۔۔ اب ہز ہائی نس نے فیصلہ کیا ہے کہ اس فضول مد میں ایک نیا پیسہ بھی ضائع نہ کریں گے ۔۔۔"

"صاحب! کافی دیر ہو گئی ہے ۔۔" درمیان میں آپریٹر گرل نے لقمہ دیا۔

"شٹ اپ ۔۔" سکریٹری دہاڑا! ۔۔ "ہاں مسٹر اب آپ کو اور کیا کہنا ہے ۔۔"

"صرف یہ ۔۔" حنیف مضطر نے ملتجیانہ انداز میں جواب دیا ۔۔ "ہمیں صرف دو آدمیوں کی حیثیت سے جینے کا ذوق دے دیجئے ۔۔"

"ملاقات کا مقصد بتلائیے ۔۔" گھوڑا گھوم پھر کر اپنے تھان پر آ گیا۔

"ہمیں ملازمت کے لئے درخواست بھجوائی ہے اُن کے پاس ۔۔!"

"اوہ ۔۔ دیکھئے مسٹر ۔۔ میں نواب عالیشان جنگ ہی بول رہا ہوں" سکریٹری کی آواز اب بھی بھاری ہو گئی ۔۔ "میرا وقت ضائع نہ کیا کیجئے ۔۔"

ساتھ ہی لائن ڈس کنکٹ ہو گئی۔

دونوں کیبن سے منہ لٹکائے ہوئے باہر نکلے اور کھسک لینے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ پوسٹ ماسٹر جو کافی دیر سے کلرک کا کام بھی سرانجام دے رہا تھا، انہیں للکارنے لگا۔

"سنئے مسٹر ۔۔ پندرہ نئے پیسے ادا کر دیتے جائیے"

دونوں کی روح فنا ہو گئی۔ گھگھیاتے ہوئے پوسٹ ماسٹر کے پاس آ کر عاجزانہ زبان میں بولے۔

"صاحب ہمارے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے"

"تو پھر کیا بات کرنے ۔۔۔" پوسٹ ماسٹر نے بات بگڑنے ہی والا تھا کہ

ایک پیکر پیکتا ہوا آیا ـــ

"نہیں صاحب نہیں ـــ" اُس نے پوسٹ ماسٹر کا ہاتھ تھام لیا ـــ "یہ ہمارے یہاں کے مشہور شاعر عباس صاحب ہیں ـــ یہ لیجئے پندرہ پیسے ـــ!"

پوسٹ ماسٹر رسید کاٹنے لگا اور وہ دونوں سینہ پُھلا کر باہر آ گئے۔.......

(جنوری ۱۹۵۶ء)

افسانچے

روشنی کے بعد

"جانِ تمنا! میں روح کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ تم سے پیار کرتا ہوں"

"لیکن میں بہت غریب ہوں!"

"محبت غریبی اور امیری میں کوئی فرق نہیں سمجھتی"

"لیکن میں......."

"لیکن کیا ــــ اگر تم حکم دو تو میں تمہارے لئے تارے توڑ لاؤں ـ"

"تمقمے پندرہ منٹ کے لئے گل ہو گئے ـ

اور جب روشنی ہوئی.......

"پیارے! مجھے پندرہ روپیوں کی سخت ضرورت ہے ـ"

"دُور ہو جا میری نظروں سے . . کمینی! خود غرض! محبت کو روپیوں سے تولتی ہے!!"

پاگل اور پولیس

پاگل ڈنڈے سے کھمبے کو پیٹ رہا تھا۔
ایک لمبا آدمی آکر پاگل کو پیٹنے لگا۔
"کیوں مار رہے ہو مجھے؟" پاگل نے پوچھا۔
"تم کھمبا کیوں پیٹ رہے ہو؟!"
"میں تو پاگل آدمی ہوں!"
"میں پولیس کا آدمی ہوں!!"

اخلاقیات

وہ دونوں فوارے کی کارنس پر بیٹھے بڑی دیر سے اخلاقیات پر بحث کر رہے تھے
"دیکھئے نا! کیا زمانہ آلگا ہے۔ شارعِ عام پر اس قسم کے عُریاں مجسمے نصب کرنا کہاں کی تہذیب ہے؟"
"اجی صاحب! کیا عرض کروں۔۔ ابھی کل ہی . . . . ارے!"
اور وہ دونوں سامنے سے گزرتی ہوئی برہنہ پگلی کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے!

گنتی داناؤں کی

ارسطو نے بھیس بدلا اور چاند کو مُنہ چڑھانے لگا۔ ذرا سی دیر میں اُس کے گرد خاصہ مجمع اکٹھا ہوگیا۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟"

"معلوم نہیں، کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے"

ارسطو بولا ——— "میں پاگل نہیں ہوں"

"پھر یہ کیا حرکت ہے؟"

"میں شہر کے پاگلوں کی تعداد جاننا چاہتا ہوں"

"پھر ——— ؟"

"معلوم ہوا کہ پاگلوں کی لایعنی حرکتوں سے دلچسپی رکھنے اور اپنا وقت ضائع کرنے والے لاتعداد پاگل یہاں موجود ہیں ——— گنتی ممکن نہیں!"

سلام اور داد

ارسطو نے بڑا حسین سا شعر سُنایا۔ حاضرین پھڑک اُٹھے، بڑی دیر تک پنڈال واہ واہ کے نعروں سے گونجتا رہا۔ ارسطو بے چارا بار بار شعر سُنا کر اور سلام کرتے کرتے تھک گیا۔ خدا خدا کر کے شور تھما۔ ارسطو نے دوسرا شعر پڑھا تو ایک گوشے سے اچانک کوئی کتا بھونکنے لگا۔ لوگ جوتے لے کر مارنے دوڑے۔ تو ارسطو نے کہا ———

"خدا کے لئے! اُسے مت ماریئے۔ مجھے بغیر سلام کے داد مِل رہی ہے!"

بہت زیادہ عقل

ایک بہت زیادہ عقلمند آدمی نے ارسطو کا گریبان پکڑ لیا اور بولا ——
"لوگ تمھیں شہر کا عقلمند ترین آدمی سمجھتے ہیں لیکن سب سے زیادہ عقلمند
دراصل میں ہوں"

"کیا ثبوت ہے تمھارے پاس ؟"

عقلمند بولا ——

"ہوشمند کو اشارہ کافی ہے —— اب تمھیں بتاؤ کیا تم یہ سوٹ پہن کر
گندے نالے میں کود سکتے ہو یا اپنا پرس کنوئیں میں پھینک سکتے ہو ؟"

"نہیں ——"

"لیکن میں یہ دونوں حرکتیں کر سکتا ہوں !"

"پھر —— ؟"

"ثابت ہوا کہ میں کپڑوں کو پہنتا ہوں اور کپڑے تمھیں پہنتے ہیں - میں پیسوں کو خرچ
کرتا ہوں اور پیسے تمھیں خرچ کرتے ہیں اور اس طرح میں تم سے زیادہ عقلمند ہوں ——"

ارسطو نے جھٹکا دے کر گریبان چھڑا لیا —— "جا بھائی اپنا کام کر !
حد سے زیادہ عقلمندی حماقت کی دلیل ہے"

دکھ

ارسطو نے چہرہ کرے کو اٹھا کر پوچھا ——
"اس جوتے میں تلا لگانے کے کتنے پیسے لوگے ؟"
"آٹھ آنے حضور !"

"چل نکل! سؤر کہیں کا ـــــ ڈپٹنے آیا ہے!"

اُس نے دھکّے مار کر بھوکرے کو باہر نکال دیا اور جوتوں کی ایجنسی میں پہنچا۔

"اس جوتے میں سول لگوانے کا کیا لیجئے گا؟"

"ساڑھے تین روپے!"

"کچھ کم نہ ہوگا؟"

"بورڈ پڑھ کر اندر آیا کرو ـــ"

اور ایجنٹ نے دھکّے مار کر ارسطو کو باہر نکال دیا!

پروفیسر ڈارون کا فلسفہ سمجھا رہا تھا ـــ

"انسان بندر کی اولاد ہے"

ارسطو بولا ـــــ

"جی ہاں! آپ کے صاحبزادے بھی یہی فرمانے تھے"

پروفیسر جھلا کر اُس کی طرف لپکا لیکن ارسطو بندر کی طرح اچھل کر نو دو گیارہ ہو گیا۔

دیا دھرم

تین فاقے ہو گئے تو ارسطو اپنا ہینڈ بیگ گروی رکھنے چلا۔

بنیا اُس وقت اپنی چارپائی کے مخمل جارہا تھا ہینڈ بیگ کو دیکھ کر دور ہی سے چھی چھی کرنے لگا ـ

"رام رام! ہم چمڑے کی چیز نہیں چھوتے ـ جیو ہتیا کے بھاگی ہو جائیں گے!"

پڑوسی

"اتنی رات گئے کون آیا ہے بھئی!"

"جی! میں ہوں آپ کی پڑوسن"

"اوہ! کہیے کیا خدمت کروں؟"

"میرا بچہ بھوکا ہے تھوڑا سا دودھ ہو تو دے دیجئے"

ارسطو نے لوٹا بھر دیا۔

دوسرے دِن کافی رات گئے ارسطو کو پڑوسن کے گھر میں بچے کے رونے کی آواز سُنائی دی تو وہ دودھ لے کر اس کے گھر جا پہنچا ——

"یہ رات کے تین بجے کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟"

"جی! میں ہوں آپ کا پڑوسی ارسطو! دودھ لایا ہوں بچے کے لئے"

مکان سے تین موٹے تازے دوسرے پڑوسی نکلے اور ارسطو پر پل پڑے۔

"کمینے! آوارہ! رات کو پرائی عورت کے گھر میں گھستا ہے!"

شریف آدمی

اور ساتویں دِن جب پارک میں وہ پھر اُس کے سامنے سے مٹکتی ہوئی گزری تو ارسطو سے نہ رہا گیا اور اُس نے ایک گلاب کا پھول حسینہ پر کھینچ مارا۔ حسینہ نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جھوم جھوم کر گانے لگا ——

"آیا کرو اِدھر بھی مری جاں کبھی کبھی......"

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا ——؟" حسینہ نے قریب آکر پوچھا۔

"جی میں کہہ رہا تھا کہ آپ کے پاؤں کے نیچے دِل ہے اِک ذرا......"

حسینہ آنکھیں مٹکا کر بولی ——

"صاف صاف بات کیجئے۔ میں ایک رات کے پچیس روپے لیتی ہوں..."

اور اُس نے چونک کر کہا ____

"معاف کرو بائی! میں شریف آدمی ہوں!"

مجبور

ایک اُچکا اجنبی کا تھیلا لے بھاگا۔ ارسطو نے پکڑنا چاہا تو اجنبی نے منع کر دیا۔
"جانے دو۔ بیچارے کو ____ ضرور تمند ہوگا"

لیکن اُچکا تھوڑی دیر بعد آکر اجنبی سے معافی مانگنے لگا ____

"بخدا مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ بھی میرے بھائی ہیں۔ یہ لیجئے آپ کی جیب کترنے کی قینچی!"

اور اجنبی جوتوں سے اُچکے کی مرمّت کرتے ہوئے بولا ____

"کمینے! اپنے ساتھ میری بھی پول کھولتا ہے!"

یکسوئی

ایک طرف مندر تھا، دوسری طرف مسجد اور گھنٹہ گھر دونوں کے درمیان تھا ارسطو گھنٹہ گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا اپنے مشاہدات قلمبند کر رہا تھا۔ مسجد میں اذان ہوئی اور نمازی ایک صف میں کھڑے ہوگئے۔ مندر میں پجاریوں نے ناقوس اور گھنٹے بجانے شروع کئے۔

"بند کرو یہ ناقوس اور گھنٹے"

"کیوں بند کریں؟"

"ہماری یکسوئی میں خلل پڑتا ہے"

"ہم تو بچائیں گے۔"

اور فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔

ارسطو نے کام سے فراغت پا کر سر اُٹھایا تو چند لاشیں ادھر پڑی تھیں۔ چند اس طرف۔ اُس نے ایک زخمی سے پوچھا ———

"یہ کیسے اور کب ہو گیا؟"

"اتنی دیر سے تو یہاں بیٹھے ہوئے ہو —" زخمی بولا — "تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں؟"

"نہیں بھائی! میں اپنے کام میں محو تھا!"

پیمانے

مسافر خانے کے لئے چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔

سیٹھ الف نے پانچسو روپے دئے کیوں کہ انھیں سٹے میں پانچ ہزار روپے ملے تھے سیٹھ ب نے ایک ہزار عطا فرمائے۔ انھیں بلیک مارکیٹ سے دس ہزار کی بچت ہوئی تھی۔

ارسطو نے اٹھنی دینی چاہی لیکن وہ حقارت کے ساتھ واپس کر دی گئی۔

ارسطو بے حد خوش تھا ———

"چلو اچھا ہوا ورنہ آج پھر فاقہ کرنا پڑتا!"

اپنے

"بیٹے! انھیں سلام کرو!"

"یہ کون ہیں ابا —؟"

"ارسطو صاحب! تمھارے چچا۔"

بیٹے نے سلام کیا۔

"بیٹے! انھیں اپنا سبق تو سُنادو"

"کون سا ابا؟"

"بندر اور بلی والا!"

بیٹے نے سبق سُنایا۔

ارسطو بہت خوش ہوا اور جب اُس نے اپنا جان کر بیٹے کو اکنی دینی چاہی تو ابا بول پڑے ـــــ

"نہیں ـــ نہیں! یہ کیا کرتے ہو بیٹے! دوسروں سے پیسے نہیں لیا کرتے!"

خلوص کار

ارسطو لپک کر اس سے بغل گیر ہوا ـــــ

"مزاج کیسے ہیں آپ کے؟"

"نوازش ہے آپ کی ـــ"

"بال بچے تو اچھے ہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے"

"کہاں تشریف لے جایئے گا؟"

"ذرا کافی ہاؤس تک جانا ہے"

"اچھا تو پھر اجازت دیجئے۔ میں عجائب گھر تک جاؤں گا"۔

رخصت ہوتے ہوئے ارسطو نے آواز دبا کر کہا ـــــ

"معاف کیجئے۔ آپ کے پیسے وقت پر ادا نہیں کر سکا، کل ضرور پہنچا دوں گا"

"اوہ وہ تو میں بھول بھی چکا۔ تین روپے آٹھ آنے پیسے ہوتے ہی کتنے ہیں"

اور ارسطو دن بھر بڑبڑاتا رہا ——
"خبیث ایک نیا پیسہ بھی تو نہیں بھولا !"

ساختہ بے ساختہ

"کون کہتا ہے کہ اُردو جنتا کی بھاشا ہے ؟" ایک مہاشے تقریر فرمارہے تھے "یہ تو ایک جاتی کی بھاشا ہے جو بدیش سے لائی گئی ہے اور......"
تب تک ارسطو کا پتھر اُن کے ٹخنے پر پڑ چکا تھا۔
"ٹھہر تو جا ! حرامزادے ! نالائق ! کمینے !"
وہ اس کی طرف لپکے لیکن ارسطو بھاگنے کی بجائے وہیں کھڑے رہ کر تالیاں بجانے لگا۔
"بولا —— اُردو بولا !"

لوک لاج

ارسطو سیٹھ کے پاس چندہ مانگنے گیا اپنے لئے نہیں انجمن کے لئے۔
سیٹھ نے انکار کر دیا
دوسری بار گیا تو سیٹھ نے بُری طرح جھڑک دیا۔
تیسری بار گیا تو سیٹھ نے دھکے دے کر نکلوا دیا۔
لیکن جب وہ چوتھی بار پہنچا تو سیٹھ انکار نہ کر سکا۔ اس نے اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے منسٹر، ڈپٹی منسٹر اور میونسپل کے صدر کی طرف دیکھتے ہوئے تجوری کھولی اور ارسطو کو دو سو روپے عنایت فرمائے۔

باقی کل

اُستاد بچوں کو پڑھا رہا تھا ـــــ

"زندگی کی دوڑ میں کامیابی انہیں کو حاصل ہوتی ہے جو عزم مُستحکم رکھتے ہیں۔ اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے مسلسل جد و جہد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ جب بھی کوئی کام شروع کرو اُسے ختم کر کے ہی دم لو۔ آج کا کام کل پر ٹالنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے اور ...."

چھٹی کی گھنٹی بجنے لگی تو ماسٹر صاحب نے کتاب بند کر دی۔ ایک لڑکے نے کہا ـــــ

"ماسٹر صاحب! ابھی سبق پورا نہیں ہوا ـــــ"

"باقی کل دیکھیں گے ـ!"

انسان اور برہمن

ایک پنڈت جی ہندو مسلم اتحاد پر تقریر فرما رہے تھے ـــــ

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مذہبی دیوانگی میں مبتلا ہو کر یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ انسان پہلے ہیں اور ہندو یا مسلمان بعد میں۔ آخر خون تو سب میں ایک ہی جیسا ہے۔ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں ...... پانی لانا ـــــ"

ارسطو نے لپک کر پانی کا گلاس پیش کرنا چاہا۔ پنڈت جی نے اس کی داڑھی کو دیکھا، شش و پنج میں پڑ گئے۔

"ہندو ہو یا مسلمان ـــــ؟"

"جی میں صرف انسان ہوں ـــــ"

پنڈت جی برہم ہو گئے

"ارے بھئی کیا جلسے میں کوئی برہمن نہیں ہے!؟"

(مارچ ۱۹۵۸ء)

پتلون کی مد

اے جان !

خدا کے لیے اس بُری طرح نہ ٹیل !

تجھے تو معلوم ہے کہ میں تیرا شوہر نامدار ہوتے ہوئے بھی تیرے حُسن طرحدار کا عاشق زار

ہوں !

لیکن اب جو جبراً گیہوں کی مد میں سترہ روپے ماہانہ تجھے کم دے رہا ہوں تو لاڈلی یہ نہ سمجھ

کہ میں انہیں اپنے آفس کی لیڈی ٹائپسٹ کے لئے تحفہ خریدنے پر صرف کر دوں گا۔

اے میرے تن بدن کی مالک !

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے تجھ سے اب بھی ویسی ہی محبت ہے جیسی شادی سے پہلے تھی۔

میں تیری ڈھلتی ہوئی جوانی اور اترتے ہوئے جھرّی دار چہرے کو نہیں، بلکہ تیرے نازک

دل کے روشن گوشے میں اپنے لئے چھپے ہوئے خلوص کو دیکھتا ہوں۔

لیکن ڈارلنگ ! کروں کیا ———؟

سچ کہتا ہوں ۔ مجبور ہوں گیہوں کی مد میں سترہ روپیہ کم کرنے کے لئے ۔

اڑسٹھ روپے کا گیہوں خریدنے کی بجائے اکاون روپے میں اتنی ہی جوار بھی تو خریدی جاسکتی ہے۔

اور اے میری فہیم و حساب داں شریک زندگی!
مجھے تیری فراست میں کوئی شک و شبہ نہیں، گو کہ مفکر ہمیشہ صنفِ نازک کو ناقص العقل کہتے آئے ہیں۔ پھر بھی میں تجھے ذہین سمجھتا ہوں۔
تجھے خدا کا واسطہ! میرے اس جذبۂ ایثار کی قدر کر۔
اور گیہوں کی مد سے سترہ روپے مجھے بخش دے!
پیاری!

میں نہیں سمجھتا کہ تجھے یہ ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہوگی کہ پیٹ میں پہنچ کر گیہوں اور جوار دونوں مساوی ہوتے ہیں۔ بلکہ میں نے آٹھویں کلاس میں یہ تک پڑھا تھا کہ جوار میں گیہوں کی بہ نسبت زیادہ حیاتین ہوتے ہیں لیکن فی الحال حیاتین کو تو چولھے میں ڈال!
کہ مجھے اس وقت وٹامن کی نہیں سترہ روپیوں کی ضرورت ہے۔
اشد ضرورت

اے دلآرام!
میں تجھے کس طرح یقین دلاؤں کہ میں نے آج تک اپنے دل میں تیرے سوا اور کسی مجبوبہ کے خیال تک کو جگہ نہیں دی۔ تیرا یہ شک قطعی بے بنیاد ہے کہ میں کسی پری چہرہ حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوگیا ہوں۔

بھلا یہ تو سوچ!
ایک مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر! جو محض ڈیڑھ سو روپے تنخواہ پاتا ہو باہر عشق لڑانے کی جرأت کیسے کرسکتا ہے!
تو کتنی نادان، ارے بھولا، معصوم ہے!

جانِ من !

مجھے تو غمِ دوراں ہی سے فرصت نہیں۔ تجھ سے پیار کے دو بول اسی قسم کے دامن خاص مواقع پر بولتا ہوں۔ باہر کے لئے وقت کہاں سے آئے گا۔

تو پھر کیا مجھے صاف صاف بتانا پڑے گا کہ مجھے ایک پتلون بنوانی ہے۔

کیوں کہ میں ایک انگریزی مڈل اسکول کا ماسٹر ہوں۔

ہیڈ ماسٹر!

آج مجھے اس پھٹے ہوئے پاجامے میں دیکھ کر معائنہ فرماتے ہوئے انسپکٹر آف اسکولس بڑی طرح بگڑے۔

وہ تو اُن کا کرم تھا کہ انھوں نے لڑکوں کے سامنے پھٹکار نہیں بتائی بلکہ الگ کمرے میں لے جاکر گرم ہوئے ورنہ بڑی کرکری ہوتی۔

اور انصاف تو یہ ہے کہ وہ بگڑنے میں بالکل حق بجانب تھے۔

انسپکٹر آف اسکولس جو ہیں۔

بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ ایک اینگلو مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر پھٹا ہوا پاجامہ پہن کر ڈیوٹی پہ جائے۔

ڈوب مرنے کی بات ہے۔

انگریزی اسکول نہ ہوا یتیم خانہ ہو گیا !

لیکن سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ انھیں صاحب کا معائنہ پر سوال

اس لئے اے میری شریکِ زندگی !

(دادرس شریکِ موت !)

میری جان ابھی سے نکلی جا رہی ہے۔ کیونکہ میرے پاس اُس پھٹے ہوئے پتلون کے علاوہ کوئی پتلون نہیں ہے۔

یوں تو قمیص بھی بالکل پھٹ گئی ہے لیکن اس کی مجھے پروا نہیں۔

اس پر تو وہ ملگجا کفنی رنگ کا کباڑیئے کی دوکان سے خریدا ہوا کوٹ پہنا جا سکتا ہے۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے اس پھٹے ہوئے پاجامے کو کوٹ سے نہیں ڈھانپا جا سکتا۔

کاش وہ کوٹ نہیں السٹر ہوتا۔

اے میری پیاری رفیقۂ حیات!

تو یقین کر کہ اگر وہ السٹر ہوتا تو میں گیہوں کی مد سے روپئے لینے کی بجائے پاجامے پر ہی اس گرمی کے موسم میں وہ السٹر پہن کر پرسوں اسکول چلا جاتا خواہ اس حالت میں مجھے اپنے آپ کو ملیریا بخار میں ظاہر کرنا پڑتا۔

مگر پیاری!

میں تیری ان حسین زلفوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔

میں واقعی بالکل مجبور ہوں۔

پتلون کی مد میں سترہ روپے خرچ کرنا میرے لئے اشد ضروری ہے۔

تو تو جانتی ہے کہ میں نے نفضولخرچی کے لئے کبھی اپنے بچوں کا پیٹ نہیں کاٹا۔

شاید تجھے معلوم نہ ہو۔۔

ابھی پچھلے ہفتے ماموں کے لڑکے کی شادی کا دعوت نامہ آیا تھا۔

اور میں نے انہیں معذرت نامہ لکھ دیا تھا کہ علالت کے باعث شادی میں شرکت کرنے سے معذور ہوں۔ کتنی معیوب بات ہے یہ؟

ہے نا ــــــ!

انھوں نے ہماری شادی کے موقع پر ایک سو ایک روپیہ نیوتہ دیا تھا۔

اور ہم ان کے اکلوتے لڑکے کی شادی میں شامل ہونے سے کترا گئے۔

لیکن میری مجبوریوں کو کچھ تو ہی خوب سمجھ سکتی ہے۔

یہ محدود تنخواہ ہمارے ماہواری بجٹ کی ہی کفیل نہیں ہو پاتی۔

ہم اس شادی میں نیوتہ دینے کے لئے روپے کہاں مدّ سے لاتے ؟

اور نیوتہ کی بات تو بہت دُور رہی ——

ہمارے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں۔

یقیناً تو انکار نہیں کر سکتی۔

اور یقیناً تو اس امر سے بھی انکار نہ کرے گی میرے لئے پتلون کی مد میں سترہ روپیہ خرچ کرنا

اشد ضروری ہیں۔

کیونکہ وہ تو خیر ماموں کے لڑکے کی شادی کا دعوتی رقعہ تھا اور اس کے لئے معذرت کرنا گا۔

بھیجنے پر صرف میرے ضمیر نے لعنت ملامت کی تھی

اور یہ تو انسپکٹر آف اسکولس کا حکم ہے۔

نوکری کا معاملہ !

اس سلسلے میں معذرت پیش کرنے کی جرأت میں ہرگز نہیں کر سکتا۔

باقاعدہ پھٹکار پڑنے کا اندیشہ ہے اسکول کے ساڑھے تین سو لڑکوں کا ہے ،،

اور اسی پر بس نہیں۔

ہو سکتا ہے مجھے باقاعدہ نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔

افسروں کا کیا بھروسہ ؟

اور میں تجھے کیسے سمجھاؤں میری جان ! کہ میں بہانے تراشنے میں کسی طرح حماں سے

کم نہیں

ثبوت تیرے سامنے موجود ہیں۔

دونوں بچے کب سے جان کھا رہے ہیں لبنتوں کے لئے اور میں کتنے بہترین بہانے

تراش لیتا ہوں انھیں بہلانے کے لئے۔

کلّو قصائی اور رام کھلاون بنیا جو اس محلّے میں قرض کو سختی سے وصول کرنے کے سلسلے میں شیطان کی طرح مشہور رہے ہیں۔ لیکن میں انہیں متواتر چار ماہ سے جُھلاوے دے رہا ہوں۔

مگر تو یقین کر کہ اسکول کے انسپکٹر صاحب اتنے بھولے نہیں کہ انھیں اپنے بچّوں یا کلّو قصائی اور رام کھلاون بنئے کی طرح بہلا پھسلا کر ٹالا جا سکے۔

اس لئے اے جان!

اچھّی طرح سوچ لے!

سمجھ لے!

کہ تجھے گیہوں کی مد سے سترہ روپے مجھے دینے ہی ہونگے۔

اس ماہ جوار کھانی ہی ہوگی۔

کیوں کہ مجھے ایک پتلون بنوانی ہے۔

اے جان!

(جولائی ۱۹۵۵ء)

اسرارِ خداوندی

مولانا شیر خاں کے لبوں سے ایک سہمی سہمی چیخ بلند ہوئی اور وہ فرطِ دہشت
سے زمین پر قلابازی کھا گئے اور اُن کی دستارِ مبارک لڑھکتی ہوئی قریب نالی میں جا پڑی
سچ پوچھئے تو میرا دل بھی سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے کوئی لوہار تانڈیں
دھونکنی دھونک رہا ہو۔ مولانا شیر خاں کوئی معمولی آدمی نہ تھے ڈیل ڈول اور جسم کی
ساخت کے لحاظ سے اسم بامسمّٰی تھے۔ خلافت تحریک، عدم تعاون اور تحفظ ناموس
رسول م کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً جتنی ہنگامی تحریکیں شہر میں اُٹھیں اُن میں اُن کا نام
نامی ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ میں اُن کی دھواں دھار تقاریر سُننے کا شرف بھی
بارہا حاصل کر چکا تھا۔ گھونسہ تان تان کر منہ سے کف اڑاتے ہوئے ایسی جوشیلی تقریر
فرماتے کہ سماں سا بندھ جاتا، معلوم ہوتا کہ ایک برہنہ شمشیر چمک رہی ہے جس کی

روانی کے سامنے دشمن کے چھکے چھوٹ جاتے۔ اسلام کے تمام ارکان میں جہاد کو سب سے
زیادہ اہمیت دیتے تھے اور آج وہ حواس باختہ چورا ہے پر چت پڑے تھے۔ اور
دستارِ مبارک نالی میں غسل کر رہی تھی پھر میرے جیسے کثیف الجثہ آدمی کا یہ یقین
کر لینا کوئی غیر فطری بات نہیں تھی کہ واقعی معاملہ بہت سنگین ہوگا اور شہر میں شاید فرقہ
وارانہ فساد پھوٹ پڑا ہے۔ معاملے کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے میں اُن کے پاس گیا اور
سہارا دیتے ہوئے ادب سے پوچھا ——

"بچئے قبلہ! کیا جھگڑا —؟ کہاں ہوا —؟ کس سے؟ — کب؟"

معلوم نہیں دہشت نے اُن کے لب سی دئے تھے یا میرے اتنے بہت سے
سوالات نے اُنھیں بوکھلا دیا تھا، انھوں نے زبانی کچھ کہے بغیر بائیں سڑک کی طرف
اشارہ کیا اور جھپٹ کر نالی سے اپنی پگڑی اُٹھا کر یہ جا وہ جا!

میں نے دیکھا ——

تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کی دوری پر ایک مجمع نظر آرہا تھا اور غل گپاڑے کے
بھنبھناہٹ یہاں تک سنائی دینے لگی تھی۔ تجسّس بُری شے ہے، مجھے یاد نہ رہا کہ
میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں اور بڑی ذمہ داریاں میرے سر ہیں۔ اس لئے
خطرے سے دُور رہنا چاہیئے۔ لپکتا ہوا مجمع کے قریب پہنچ ہی تو گیا۔ محفوظ جگہ پر پنجوں
کے بل کھڑے ہو کر دیکھا تو ایک شخص درمیان میں کھڑا تھا، کپڑوں کی جگہ بدن پر خراشیں
آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے وہ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر اور اُچھل اُچھل کر چیخ رہا تھا —

"کہاں ہے خدا؟ کدھر ہے خدا؟ میں نہیں مانتا کسی خدا کو — بڑا آیا خُدا
کہیں کا — اگر ہے تو اس وقت کہاں تھا۔ جب میری ماں نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھوک
سے دم توڑ دیا۔ اُسے رحم کرنے والا کہتے ہو —— تب اس کی رحمت کہاں سو گئی تھی
جا کر ——؟"

"استغفراللہ!" میرے پاس کھڑے ہوئے ایک صاحب جگہ خالی کرتے ہوئے بولے — "اللہ شرک سے محفوظ رکھے —"

چند شریر لڑکوں نے اس پر پتھر پھینکے لیکن وہ اس طرح لاابالیانہ انداز میں تقریر کرتا رہا جیسے اس پر پتھر نہیں پھول برس رہے ہوں۔

"کہتے ہیں وہ بڑا اجبار بھی ہے۔ میری نوجوان لڑکی کی عصمت دن دہاڑے کپاس کے کھیت میں لوٹ لی گئی۔ لیکن وہ خاموش رہا اس کی قہاری کا مظاہرہ تو اس وقت ہوا جب مل مالک کی لڑکی سے ایک نوجوان غلطی سے ٹکرا گیا تھا اور پھر اس نوجوان کی لاش ہی تھانے تک پہنچائی جا سکی تھی۔ مگر میری لڑکی چیختی رہی اور بین ڈہائیاں دے دے کر بیہوش ہو گیا۔ لیکن زمیندار پر کوئی قہر نہ ٹوٹا خدا نے اُلٹے میری بیٹی نے ہی کنویں میں چھلانگ لگا دی اس لئے کہ وہ ایک غریب فاقہ کش کسان کی بیٹی تھی —— کیا ہو گیا تھا اس وقت خدا کے قہر و غضب کو؟"

جواب میں اس پر پھر پتھروں کی بوچھار ہوئی ایک اینٹ اس کے داہنے ابرو پر پڑی اور خون کی دھار اُس کی پلکوں سے ٹپک ٹپک کر داڑھی میں جذب ہونے لگی۔ وہ اتنی زور سے چیخا کہ اس کی آواز پھٹ گئی ——

"تم سمجھتے ہو اس طرح مجھے خُدا کے وجود کا قائل کر دو گے؟ ہونہہ! — خدا!"

اُس نے مُنہ جھکا کر ایک طرف تھوک دیا۔ اس کی اس حرکت پر مجمع بُری طرح مُشتعل ہو گیا اور پھر اُس پر لاتوں، گھونسوں اور جوتوں کی اتنی تیز بارش ہوئی کہ میں نے چُپکے سے وہاں سے کھسک جانے میں خیر سمجھی لیکن اس رات دل میں بڑی دیر تک ایک خلش سی ہوتی رہی۔

کیا خدا اتنا ہی کمزور ہے کہ ایک دُکھیارے مظلوم پاگل بڈھے کو اپنا

معترف بنانے کے لئے اُسے سیکڑوں لوگوں سے بیر لینا پڑا ہے۔ پھر خیال آیا اُس کی ایک صفت تو ادبی بھی تو ہے۔

دوسرے دن صبح ندی کی طرف جا رہا تھا کہ وہی کل والا پاگل شیوجی کے مندر میں دکھلائی دیا۔ احاطے کے وسط میں شیوجی کی عظیم الشان مورت نصب تھی اور پاگل ایک ایک کونے میں پتھر جمع کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کا بایاں ہاتھ بے جان ہو کر جھول رہا ہے جیسے شاید کل مجمع میں کسی خدائی فوجدار نے توڑ دیا ہوگا۔ سوچا پاگل ٹھہرا کہیں جنون میں ایک آدھ پتھر مجھے ہی نہ جڑ دے! اپنی راہ لی۔

آدھ گھنٹے بعد واپس پلٹا تو احاطے کے گرد ایک بھیڑ سی لگی ہوئی تھی اور پاگل اپنی دُھن میں مست مورتی پر لگاتار پتھر برسا رہا تھا۔ ہر پتھر کے ساتھ اُس کے منہ سے گالیوں کا ایک فوارہ سا اُبلتا تھا ——

"کیوں —— ایشور اور اللہ تیرے ہی نام ہیں نا! اچھا —— اب روک ان پتھروں کو اپنی طاقت سے —— دیکھو لوگو! میں نے تمھارے بھگوان کو کانا کر دیا ہے اور وہ خاموش ہے —— یہ لو دوسرا کان بھی گیا۔ واہ رے میرے مٹی کے بھگوان! ایک انسان سے اس طرح پٹ رہا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ کہاں گئی وہ تیری ایٹم بار شکتی —— کدھر ہیں وہ تیرے بھگت —— خبردار —— سالے کوئی میرے سامنے آیا تو کھوپڑی ہی توڑ دوں گا۔ ایک پتھر پڑ گیا تو سات پشتیں اُردو بولیں گی ——"

چند جوشیلے نوجوان جو دھیرے دھیرے پاگل کی طرف بڑھ رہے تھے پھر پیچھے ٹھٹک گئے اور جب پتھروں کا وہ ڈھیر جو پاگل کے سامنے تھا، ختم ہو گیا۔ تو میں وہاں نہ ٹھہر سکا۔ بھگوان کے بھگتوں نے اُس کا دوسرا ہاتھ بھی توڑ دیا۔

اُس رات میں نے کئی بار اپنے دِل سے سوال کیا کہ کیا واقعی بھگوان کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی !

پھر مجھے چند ماہ کے لئے باہر جانا پڑا۔ اس اثناء میں ایک ہم وطن سے معلوم ہوا کہ شہر میں فساد پھوٹ پڑا تھا۔ پتہ نہیں کہاں کا پاگل وہاں آکر مر گیا تھا۔ ہندو کہتے کہ اس کا کریا کرم ہم کریں گے اور مُسلمان اُس کی تجہیز و تکفین کا شرف خود حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جب جھگڑے نے طول کھینچا تو مجبوراً حکومت کو اس کی لاش خود ٹھکانے لگانی پڑی۔ کچھ دن تک یہ واقعہ بھی دِل میں کھٹکتا رہا اور رفتہ رفتہ ذہن نے اسے بھی فراموش کر دیا۔

لیکن آج جب میں اپنے شہر کو واپس لوٹا ہوں تو اس پاگل کی یاد پوری شدت سے اُبھر کر سطحِ ذہن پر آگئی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کو لوگ جبّار و قہار کیوں کہتے ہیں، وہ خدا جو اپنے بر تر بندوں پر اس طرح رحمت نازل کرتا ہے۔ جبار و قہار کیسے ہو سکتا ہے !

ہندو مسلم اتحاد کا اِتنا متاثر کن منظر میری آنکھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ صبح سے تانگے پر ایک مولانا اور ایک پنڈت جی لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرتے پھر رہے ہیں جگہ جگہ اُردو اور ہندی میں پوسٹر چسپاں ہیں۔

"ایشور اللہ تیرے نام" ــــــ حضرت صوفی مجذوب شاہ رحمتہ اللہ علیہ عرف سورگیہ باورے بابا کا عرس اور میلہ پولیس گراؤنڈ پہ آج رات سے شروع ہو رہا ہے شرکت کر کے ثواب دارین حاصل کیجئے اور پدھار کر اپنی ایشور بھگتی کا پتہ دیجئے۔"

تفتیش سے معلوم ہوا کہ مجذوب شاہ عرف باورے بابا وہی پاگل تھا۔ دماغ نے دِل سے سوال کیا یہ سب کیا ہے اور اُس نے بغیر سوچے جواب دیا ؟ خدا کی باتیں خدا ہی جانے !

(فروری ۱۹۵۹ء)

گندی چادر

وہ ایک افسانہ نگار تھا

ابھی حال ہی میں اُس نے لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن اس مختصر سی مدت میں ہی اُسے وہ کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ جو بڑے بڑے ادیبوں کو نصیب نہ تھی۔ اُس کے افسانے سماج کی بُرائیوں پر ضربِ کلیم کا اثر رکھتے تھے۔ انوپ چند لین میں رہتا تھا وہ۔ عام طور پر اس جگہ دن میں سنّاٹا اور ویرانی سی رہتی تھی۔ شام کو البتہ کچھ دیر کے لیے چہل پہل ہو جاتی تھی۔ اُس دن بھی وہ بارہ بجے دن میں اپنے مطالعہ کے کمرے میں میز پر جُھکا ہوا۔ ایک طنزیہ افسانہ لکھنے میں مصروف تھا کہ باہر گلی میں دُور سے آتا ہوا مکھیوں کی بھنبھناہٹ کا سا شور سُنائی دیا اور وہ چونک پڑا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ منتشر ہو گیا۔ بات غیر معمولی تھی۔ عام حالت میں دوپہر میں ایسا موت کا سا سکون اس گلی پر اپنا تسلط جما لیتا تھا جس میں اُسے افسانہ لکھنے کے سُنہرے مواقع دستیاب ہو جاتے تھے۔ اس کا دماغ اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ اس شور کو سُن کر چیخ پکار بتدریج

بڑھتی جارہی تھی۔ اُس نے جھنجھلا کر قلم پیڈ پر ڈال دیا اور اُٹھ کر کھڑکی کی جھلملی سرکا کر نیچے جھانکنے لگا۔

داہنی طرف کی چمپا اسٹریٹ سے بچّوں کا ایک جھنڈ جیسے اُبل پڑا تھا۔ چیختا ہوا اور نعرے لگاتا ہوا۔ بچّوں کے آگے ایک برہنہ عورت بے تحاشہ بدحواسی کے عالم میں بھاگتی چلی آرہی تھی۔ کلّو موچی کے دروازے کے سامنے پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہ دھڑام سے نیچے آرہی۔ افسانہ نگار کا دِل دہل گیا۔ شریر بچّوں کے جھنڈ نے پگلی کو گھیر لیا اور سب مِل کر زور زور سے چیخنے لگے ——

"کالی مرچیں —— دھیلے سیر ——"

"پگلی ہے بھئی پگلی ہے۔"

"پگلی کا دو ٹھا تھانیدار۔"

اور اِسی قسم کے نہ جانے کتنے بے معنی جُملے۔ دماغ بھنّا دینے والے بڑھتے ہوئے شور سے تنگ آکر افسانہ نگار کو اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لینا پڑیں۔ نہ جانے اُن چھوٹے شیطانوں کا غول اور کتنی دیر تک پگلی کو دق کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے تنگ کئے رہتا کہ کلّو موچی گھر سے ایک بڑا سا ڈنڈا لئے ہوئے برآمد ہوا —— بچّے اُسے دیکھ کر سہم گئے۔ کچھ نٹ کھٹ جو اب تک چیخے جارہے تھے اُنھیں ڈانٹ کر اور دوسرے بچّوں کو سمجھا کر کلّو نے پگلی کو اُن کے نرغے سے باہر نکالا۔ وہ میدان صاف پاکر بے تحاشہ بھاگی اور گلی کے دوسرے موڑ پر پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ بچّوں کا غول اپنے دِلچسپ مشغلے میں کلّو موچی کی دخل اندازی پر اُسے کوستا ہوا بیدلی کے ساتھ تتر بتر ہونے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد گلی پہلے ہی کی طرح سُنسان ہوگئی۔ افسانہ نگار نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑکی سے ہٹ کر اپنی کرسی پر آگیا۔

اور پھر اس واقعہ کے بعد اُس نے پگلی کو مختلف حالتوں میں کئی جگہ دیکھا

پارکوں میں، مسجد کی سیڑھیوں پر، مندر کے پیچھے، تنگ و تاریک گلیوں میں۔ غرضیکہ شیلانگ کے تقریباً ہر حصّے میں ڈیوی اس پاگل لڑکی کو برہنہ بھٹکتی ہوئی دیکھا تھا۔ ہمیشہ وہ مادرزاد ننگی ہی ملتی۔ موٹے موٹے ہونٹ، سیاہ جلد، بکھرے ہوئے اُلجھے بال، بدن پر جما ہوا سیروں میل اور اُس پر برہنگی۔ اس مجموعی ہیئت کذائی سے بجائے ہمدردی کے لوگوں کو اس پگلی سے کراہیت اور نفرت سی ہوگئی تھی۔ لوگ اس سے اس طرح بدکتے تھے۔ جیسے وہ کوئی خارشی زدہ کُتیا ہو۔ البتہ شریر بچّوں کے لئے وہ ایک دلچسپ تماشہ تھی۔ اُسے پریشان کرنا، پتھر مارنا اور چڑانا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ بچے جتنی زیادہ اُس میں دلچسپی لیتے، بڑے اُتنا ہی اُس سے بچتے تھے۔ شاید اُس کی بدصورتی، گندگی اور غلاظت سے زیادہ اُس کی برہنگی کی وجہ سے۔ بہرحال کوئی اُسے اپنے گھر یا دکان کے قریب کھڑا تک نہ ہونے دیتا تھا۔ اُسے تعجب تھا۔ جب کوئی اُسے بھیک تک نہیں دیتا تو وہ اب تک زندہ کیسے ہے۔ اگر یہی پگلی کچھ حسین ہوتی! اور اپنے جسم کو ریشمیں ملبوسات میں پنہاں کر سکتی تو اُس کے بھی سیکڑوں پروانے ہوتے۔

ایک دن میں وہ کسی اچھے افسانے کے لئے پلاٹ اور مواد کی فکر میں کمرے میں بیٹھا دماغ اِدھر اُدھر دوڑا رہا تھا۔ اُس دن اُس کی طبیعت صبح سے ہی مضمحل تھی۔ کوئی کام کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ آفس سے رخصت اس لئے لی تھی کہ سکون سے بیٹھ کر اُن پرچوں کے لئے افسانے لکھے گا۔ جنھوں نے تقاضے کے ساتھ ساتھ خلاف دستور پیشگی معاوضے بھی بھیج دئے تھے لیکن طبیعت کچھ لکھنے کی طرف راغب ہی نہ ہوتی تھی۔ قلم ہاتھ میں لئے وہ سامنے پڑی ہوئی نوٹ بک پر کچھ لکھنے کی بجائے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب تک اسی طرح صفحات خراب کرتا رہا کہ اس کا دوست دیویندرپن آ گیا۔

"کیوں بیٹے!" وہ اُس کی پیٹھ پر دھول جماتا ہوا بولا ـــ "کیا پلاٹ نہیں مل رہا ہے کسی افسانے کا؟ روتی صورت بنائے کیوں پڑے ہو؟"

وہ جھنجلا کر کھڑا ہو گیا ــــ

"ابے زید کے بچے! مجھے یہ بے وقت کی شہنائی اچھی نہیں لگتی۔"

"اچھا جی ــــ؟" دید نے آنکھیں مٹکائیں "یہ نخرے ہیں آپ کے۔ کوئی بات نہیں، بیٹھے بسورتے رہو۔ ہابدولت تو سیر کو جا رہے ہیں۔"

"کیا سچ ــــ" وہ قلم جیب میں کھونستا ہوا بولا ــــ "ٹھہرو۔ باپ بدولت کا موڈ بھی بن رہا ہے۔۔۔"

اور پھر دھانہیں بڑھنگے کپڑوں اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ دید مرین کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باہر آگیا اور تب اُسے معلوم ہوا کہ وہ کتنی دیر تک بیکار پڑا رہا تھا شام کے پانچ بج رہے تھے۔ سورج کی سنہری کرنیں نیلانگ کی سڑکوں، گلیوں اور پہاڑیوں کو منور کئے تھیں۔ انوپ چند لین سے نکل کر وہ دونوں جی۔ ایس روڈ پر آگئے۔ کھاسی پہاڑیوں کا سارا حسن سمٹ کر شاید آج نیلانگ کی گلیوں اور سڑکوں میں بکھر گیا تھا۔ ہر چہرا نکھرا ہوا نظر آتا تھا۔ ساریاں، اسکرٹ، پہاڑی لہنگے اور بھانت بھانت کی صورتیں دیکھتے ہوئے وہ دونوں گاڑی خانہ۔ کھاد اور لائی کھڑا وغیرہ تمام گندے محلوں میں گھومتے پھرے۔ جہاں سماج کی غلاظت بکھری پڑی تھی لیکن باشندے حسین اور حسن پرست تھے۔ اور جب وہ ادھر اُدھر بھٹک کر نگلسن روڈ پر آئے تو انھیں ٹانگی گیراج کے سامنے سیکڑوں آدمیوں کا مجمع نظر آیا۔ وہ دونوں مجمع کے قریب پہنچے تو افسانہ نگار چونک پڑا۔ وہی لڑکی جسے چند ماہ پہلے اُس نے انوپ چند لین میں دیکھا تھا۔ ایک شریف صورت اینگلو انڈیٹ نوجوان سے بُری طرح لپٹی ہوئی تھی۔ پہلے سے بدرجہا سیاہ اور گندی حالت میں اُس کے جسم سے تعفن کے بھبکے نکل رہے تھے اور وہ حسب دستور برہنہ تھی۔

دو تین آدمیوں نے کافی جدوجہد کے بعد اس نوجوان کو لڑکی کے چنگل سے نکالا اور

اور وہ بے چارہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ جیسے دُنیا کی تمام بد ارواح بل کر اس کا پیچھا کر رہی ہوں اور پھر لوگ اس پگلی سے بچ بچ کر نکلنے لگے۔ چلتے چلتے افسانہ نگار نے نوٹ کیا کہ پگلی کا پیٹ پھُولا ہوا ہے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ تھی۔ افسانہ نگار کی کنپٹی کی رگیں چٹخنے لگیں۔ اُف ۔ لوگ اُس سے اتنی نفرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر بھی جانے کس شریف ابنِ شریف کس مولانا یا پنڈت صفت بزرگ نے رات کی سیاہی میں اس پگلی کے ساتھ مُنہ کالا کیا ہوگا۔

اور یہ ناقعہ بعد میں آنے والے کئی دِنوں تک اس کے دماغ کو پریشان کرتا رہا۔ دِل میں خلش پیدا کرتا رہا۔ پھر ایک دِن ویدسرین عجیب سی صورت بنائے اُس کے پاس آیا۔

"منظور! تم خاک افسانہ نگاری کرتے ہو ــــ جی۔ ایس۔ روڈ پر تمہاری سیاہ رد پگلی برہنہ بے ہوش پڑی ہے۔ ابھی آدھ گھنٹہ قبل اُس نے ایک بچے کو جنم دیا ہے ــــ ہاں اسی سڑک پر، سب لوگوں کے سامنے۔ اور لوگ ناک پر رومال رکھ رکھ کر ادھر سے نِکل رہے ہیں۔ شاید انھیں میں اُس معصوم رُوح کا باپ بھی ہوگا۔ جس نے اس ننگی سڑک پر ننگی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور تم یہاں خاموش بیٹھے ہو۔ کیا تم اس پگلی پر ایک افسانہ نہیں لکھ سکتے۔"

اور پھر کئی پلاٹ اُس کے خیالوں میں ناچ گئے اور اسی وقت وہ قلم اُٹھا کر افسانہ لکھنے لگا۔ لکھتا رہا۔ صفحات سیاہ ہوتے رہے۔ الفاظ قلم کے مُنہ سے اُبلتے رہے۔ افسانہ تیار ہوگیا۔ اور وہ اُسی وقت اسے ایک مشہور رسالے کو پوسٹ کرنے کے لئے نِکل کھڑا ہوا۔

اور جب وہ افسانہ پوسٹ کر کے واپس آرہا تھا تو جی۔ ایس۔ روڈ کے فٹ پاتھ پر اُس نے دیکھا ایک بوڑھی بھکارن اپنی پھٹی چکٹ چادر سے بے ہوش پگلی کا جسم ڈھانکے ہوئے نوزائیدہ بچے کو پچکارتی ہوئی بیٹھی ہے!

اور اس کے دل کو زور کا دھکا سا لگا۔ اور کسی نے اس کے اندر سے کہا۔
"تمھارا افسانہ اس پگلی کے کس کام آیا ——————؟ تم نے تو اُسے اور بھی ننگا
کر دیا ہے۔ افسانہ نگار! اُس کا پردہ تو اس بھکارن کی پھٹی چیکٹ چادر ڈھانکے
ہوئے ہے!!!"

(اگست ۱۹۵۴ء)

مول گنج کی صبحیں

شاید آپ پہلی بار تشریف لائے ہیں کانپور۔ تبھی تو دِن دہاڑے مول گنج
کا ذکر کر رہے ہیں ورنہ مول گنج کا ذکر تو یار لوگ چوری چھپے کرتے ہیں۔ ابھی پرسوں ہی کی تو
بات ہے میں نے اپنے ہم عُمر ماموں بشارت سے مُول گنج چلنے کو کہا تو وہ اس بُری طرح
مجھ پہ بگڑے جیسے میں نے ان کے سامنے جہنم چلنے کی پیشکش رکھی ہو۔ حالانکہ میں اچھی طرح
جانتا ہوں کہ وہ ہر رات جو اتنی دیر تک غائب رہتے ہیں اور واپس آ کر اپنی بیوی کو
صلواتیں سناتے ہیں، مارتے پیٹتے ہیں تو اس کی خاص وجہ مُول گنج کی سیر ہی ہوتی ہے اور
پھر اس دن میں انھیں لیکر مول گنج کے بالاخانے پر نہیں بلکہ اُس محلے میں واقع ہوٹل "شاد افزا"
کے منیجر سے چند باتیں طے کرنا چاہتا تھا جن سے اُن کے قریبی تعلقات ہیں۔ پھر بھی وہ مجھ پر
برس پڑے تھے۔ جانے کیا سمجھا تھا انھوں نے ـــ اور ایک آپ ہیں صاحب!
کہ اس طرح شاہراہِ عام پر کھڑے ہو کر مُول گنج کا راستہ پوچھ رہے ہیں ـــ لیکن ہو سکتا ہے
بات کچھ اور ہی ہو اور میں نے بھی اپنے ماموں کی طرح آپ کو غلط سمجھا ہو۔ ایں! ـــ

کیا کہتے ہیں آپ ؟ — آپ مول گنج کسی دوسرے کام سے نہیں جانا چاہیئے — آپ وہاں کے بالاخانوں کا بھی معائنہ فرمائیں گے ! — کمال ہے جناب ! آپ بھی بڑے صاف گو انسان ہیں اور ساتھ ہی ساتھ عجیب بھی — نہیں نہیں، میں آپ کو پاگل تو خیر نہیں سمجھتا۔ پھر بھی بھولا کوئی ٹیک ہے اس وقت مول گنج کی سیر کی — صبح سات بجے مول گنج کی سیر — کیا خاک لطف آئے گا اس وقت وہاں — اجی صاحب مول گنج چلنا ہے تو شام کو تشریف لے چلئے گا — اندر کا اکھاڑہ اور قاف کی پریاں نوک پلک سنوارے آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک، دل کو سرور، خون کو گرمی اور جذبات کو ہیجان بخشنے کے لیئے طرح طرح کے جتن کرتی ہوئی دکھائی دیں گی — جی ! — مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے — میں تو خادم کا بندہ ہوں، گائیڈ جو ٹھیرا — رہنمائی میرا کام ہے ! — آپ حکم دیجئے — جدھر کہئے گا چلوں گا — پھر بھی آپ صبح ہی صبح — اوہ ! — آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں ! اے رکشا — ادھر آنا — دو سواری — مول گنج — چل چل آگے بڑھا اپنا رکشا۔ اَبے ! دس آنے تو اسٹیشن کے نہیں دیتے ہم سے یہ تو برہانہ روڈ ہے۔ یہاں سے ہے ہی کتنی دور — نہ آٹھ آنے بھی نہیں — چھ آنے ملیں گے۔ اچھا خیر اب انھوں نے کہہ دیا ہے تو سات آنے ہی سہی — آیئے صاحب ! تشریف رکھئے۔ جی ہاں میں یوں ہی ٹھیک ہوں — دراصل یہ رکشا والے انجان آدمیوں کو اسی طرح ٹھگ لیتے ہیں — ابے چل چپ رہ — مجھ سے لکھنؤ کی ہی بول رہا ہو جیسے کیا پہلی بار مول گنج جا رہا ہوں — تین آنے سواری عام طور پر جاتی ہے — اجی ! کب فرمایا آپ نے ؟ — جی ہاں بس اگلے موڑ سے کوتوالی کے سامنے سے حسن روڈ شروع ہو جاتی ہے — اس شہر کی سب سے زیادہ بارونق اور دولتمند سڑک وہ عام طور پر بڑے بڑے بینک، فرموں کے دفاتر اور شو روم اور عالی شان دکانیں اس سڑک پر واقع ہیں — اے یہ لیجئے ! — دیکھئے کیا گیا نیک بوس ہمارا یہی ہے — ابھی تو

صبح ہی ہوئی ہے۔ تھوڑا اور دن چڑھنے دیجیے پھر یہاں اتنی چہل پہل ہوگی، اتنا شور
غل ہوگا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے گی —— بس تھوڑی دور اور —— اب
روک دے میرے بھائی! —— دیکھیے صاحب ساتھ آئے اس کو۔ مولگنج آگیا ——!

لیجیے جناب! دیکھ لیجیے۔ یہ ہے آپ کا مول گنج —— آپ ناراض ہوں گے۔ لیکن
کہنے والی بات کہنے میں آتی ہے۔ آپ قطعاً ناوقت تشریف لائے ہیں یہاں۔ کیا ملے گا اس
وقت اس جگہ۔ ہر شکل اجڑی ہوئی نظر آئے گی۔ صبح کا وقت اس چمن کا عہد خزاں ہے
اس گلشن میں تو کچھ شام ہی کو بہار آتی ہے حسین مکھڑے —— رنگین آنچل —— مخمور نگاہیں
دلنشیں ادائیں —— دل پھینک لوگ اور دلربا نظارے تو کچھ اسی وقت مل سکتے ہیں۔
بس یہ سمجھیے کہ حسن و عشق کا بازار گرم ہوتا ہے یہاں سر شام سے۔ جس کے گاہک نیم شب
تک رخصت ہو جاتے ہیں یہاں سے اور دکاندار صبح کاذب ہوتے ہوتے اپنی دکان
بڑھا دیتے ہیں —— دیکھیے تو کیسی دھول اڑ رہی ہے یہاں ——!

پیچھے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ جو لائن یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔!
دکانوں کی ہے۔ عام دکانوں کی۔ حسن کی دکانیں اور عصمت کے خوانچے۔ ان بالائی
منزلوں پر سجتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہاں کیا دھرا ہے؟ —— ذرا ادھر دیکھیے —— وہ ——
جو بکھرے بالوں اور جھرّی دار چہرے والی ادھیڑ عمر کی عورت چھجے پر بیٹھی ہوئی کمر دبوا رہی
ہے۔ آہستہ آہستہ کراہ رہی ہے۔ دراصل اسے اس طرح کراہنے اور دبوانے بیٹھے
رہنے کی ایک عادت سی پڑ گئی ہے۔ رات کو بھی اور دن کو بھی۔ ہاں تو اس وقت تو
وہ آپ کو بالکل چڑیل کا ... رہی ہے لیکن شام کو اس کا رنگ ہی دوسرے ہوتے ہیں
—— بس معلوم ہوتا ہے دوبارہ شباب پر آ گئی ہے۔ سینکڑوں دل مرتے ہیں اس پر ——
لکھ پتی ہے سالی —— آٹھ نو سال قبل اسی شہر میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ لیکن تھی بڑی اکڑ فوں
—— کسی کو پیٹھ پر ہاتھ نہ رکھنے دیتی تھی۔ اس وقت
بڑے خون خرابے اور دیکھا بھالی ...

ہوئی صاحب اس کے پیچھے ۔۔۔ لیکن آخر ملیٹر کو پنجے ٹیکنے ہی پڑے ۔ ایک بابو اسے شادی کا چکمہ دے کر اڑا لے گئے ۔ دو چار مہینے مزے سے کئے اور پھر اس کو تمت دلال کے ہاتھ بیچ دیا ۔ اور اس نے اس پھول کو لاکر مول گنج کے گلدستے میں سجا دیا ۔ !

کون ـــــ ؟ اس تیسری کھڑکی پر ـــــ ! یہاں کی مشہور رنڈی ہے وہ ـــ خورشید نام ہے حرامزادی کا ـــ پہنچی ہوئی حرافہ ہے ۔ اچھے اچھے شریف خاندانوں کی بہو بیٹیوں کو لا بٹھایا ہے اس نے اس بازار میں ـــــ ایک ایک چھوکری کے پیچھے ہزاروں خرچ کرنے پر آمادہ رہتی ہے ـــ معلوم نہیں سچ ہے یا جھوٹ ۔۔ میں نے بھی سنا ہے یہ کسی غریب باپ کی بیٹی تھی ۔ جس نے جوڑ نہ ملنے کی وجہ سے اسے ایک بڈھے کلرک سے بیاہ دیا تھا اور وہ خود اطمینان سے ملکِ عدم کو سدھار گیا ۔ پھر عین شراب کے عالم میں اس کا بوڑھا شوہر بھی مر گیا ۔ مجبوراً اسے اس بازار میں پناہ لینی پڑی ۔ اور اب یہ ہر اس مصیبت زدہ لڑکی کو جس کا دنیا میں کہیں ٹھکانہ نہ ہو ، بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے ـــ اور پھر اُن کے جوہرِ عصمت کو اپنے پرانے و مستقل گاہکوں کے شہوانی جذبات کی دہلیز پر بھینٹ چڑھا کر منہ مانگے دام وصول کرتی ہے !

آئیے اس طرف بائیں ہاتھ کو گھوم آئیے ۔

یہ روٹی والی گلی ہے ـــ لاحول ولا قوۃ ـــ اِدھر کہاں جھانکنے لگے آپ ؟ ـــ آخ تھو ! ـــ کیا کہتے ہیں آپ ؟ یہ انسانیت کی عصمت کا خون ہے ـــ ہی ہی ہی ـــ انسانیت کی عصمت کا خون ! ـــ اوہ معاف کیجئے گا ـــ میں آپ کی ہنسی نہیں اڑا تا ـــ لیکن بات ہی کچھ ایسی مضحکہ خیز تھی ـــ انسانیت کی عصمت کا ......

خیر جانے دیجئے !

یہ کون چلا آرہا ہے سامنے سے ؟ ـــ ارے ! یہ تو رئیس ہے ـــ کیوں

بھئی رئیس ! خیریت تو ہے نا ؟ ــــ ہاں بھائی صاحب ! ہم بھی جئے جا رہے ہیں
تمہیں لوگوں کے سہارے ــ کہو کاروبار کا کیا حال ہے ؟ ــ کیا کہتے ہو ؟ ــــ
نیا مال لائے ہو کشمیر سے ــ صرف دو سو روپے ہیں ! ــ اماں سچ کہو ؟ ــــ
عقل باور نہیں کرتی کہ اتنی نفیس چیز اتنی مندی بک گئی ہو ــ اچھا یہ بات ہے ــــ
مہاجر کیمپ سے لائے ہو آفیسروں کو رشوت دے کر ــ ہاں بھائی ! اپنی اپنی قسمت
ہے ــ اور وہ جو جے پور کے ودھوا آشرم سے تین پھلجڑیاں لائے تھے ــ ان کا کیا ہوا ــ
اُفوہ ــ سترہ ہزار میں ــ یعنی اکٹھا دس گُنا منافع کا ملا ! ــ جیو میرے شیر ! ــ
نہیں بھائی ــ یتیم خانہ کا منیجر میرا آشنا سا نہیں ورنہ ضرور تمھاری سفارش کرتا ــ
اجی تمہیں سفارش کی ضرورت ہی کیا ہے ــ مٹھی گرم کردینا اور چھانٹ لانا دو چار
لاوارث جوان پھول ــ کیا باتیں کرتے ہو ــ آجکل تو پیٹ بھرنا دوبھر ہو رہا ہے
ہمیں ــ ان جیسے دو چار شریف بابو لوگوں کو شہر میں گھما لاتا ہوں تو دو چار روپے
مل جاتے ہیں ــ یہ تو بھائی تم ان سے خود کہو ــ میں بھلا کیا سمجھا سکتا ہوں انھیں ــ
وہ تو میں پہلے ہی سمجھتا تھا ــ یہ تو صرف گھومنے کی غرض سے نکل آئے ہیں اِدھر ــ
ناچ گانے سے انھیں کیا مطلب ــ ارے بھائی جان ! جب انکار کردیا صاف تو کیوں
گلے پڑتے ہو بیچاروں کے ــ اگر یہ رات کو آنے والی اسامی ہوتے تو یوں صبح ہی
صبح یہاں کے چکر کیوں کاٹتے ــ ؟ ہاں بھائی ــ اپنا اپنا مزاج ہے ــ یہ صرف دیکھنے
پر اکتفا کر لیتے ہیں ــ وہ بھی رات میں نہیں دن کو ــ اچھا چل دئے ــ وعلیکم السلام
ورحمت اللہ !

جی کون ــ ؟ جو ابھی باتیں کر رہا تھا ــ جی ہاں دلال ہے ــ تبھی تو آپ کو آج
رات کو بالاخانے پر آنے کی دعوت دے رہا تھا ــ نہیں جناب یہ دیکھئے ــ بڑے اچھے
گھرانے کا چشم و چراغ ہے ــ وہ دیکھئے ــ جہاں اب غریب نواز ہوٹل کا بورڈ لٹک رہا ہے

دس سال پہلے اس جگہ جوتوں کا ایک بڑا سا کارخانہ تھا اُس کے پروپرائیٹر تھے غفور خاں
صاحب ـ بڑے ہی عیاش طبع تھے ـ ساری آمدنی رنڈیوں پر صرف کرتے تھے ـ تب
یہ رئیس مجھ سے پڑھتا تھا ـ جی نہیں اسکول میں نہیں ـ گھر پر ٹیوشن پڑھاتا تھا میں ـ
جی ہاں کچھ دنوں یہ کام بھی کیا ہے میں نے ـ صاحب! بیکاری بڑی بُری بلا ہے ـ
کون سا کام مجھ سے چھوٹا ہے ـ اب تو یہ گائیڈ والا دھندا بھی ٹھپ ہوتا نظر آتا ہے
کسی دوسرے اچھے دھندے کی تلاش میں ہوں ـــ اوہ! میں کہاں سے کہاں پہنچ
گیا ـ ہاں تو اس وقت میں اس رئیس کو ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا ـــ کیا بتاؤں بابوجی! ـ
میں تو ایک گوشے میں بیٹھا لڑکے کو پڑھاتا رہتا اور غفور خاں مرحوم بالکل سامنے والی
کھڑکی میں کھڑے ہو کر پڑوسی طوائفوں سے ایسے ایسے فحش مذاق کیا کرتے کہ وہ لڑکا
تو کیا میں خود شرم سے پانی پانی ہو جاتا تھا ـــ پھر بھلا لڑکے پر کیوں نہ اثر پڑتا ـ ان
باتوں کا ـ نتیجہ دیکھ لیجئے ـــ اچھا خاصہ جوتوں کا کاروبار تھا ـ کئی مکانات تھے ـ
سب کچھ چوپٹ ہو گیا ـ مال و دولت خاک میں مل گئی ـ اب صاحبزادے حسن کے دلال
ہیں ـ ہمیشہ اس فکر میں غلطاں رہتے ہیں کہ مول گنج کی منڈی میں اُن کے توسط سے
گلستانِ حُسن کے نئے پھول پہنچتے رہیں ـــ اب دیکھئے مجھ غریب کو ہی پھانس کر لایا تھا
یتیم خانے کے مینجر سے سفارش کے لئے کہتا تھا ـ اوہ! آپ کے کان پک گئے سُنتے سُنتے ـ
اچھا صاحب! لیجئے چُپ ہوا جاتا ہوں!
جی نہیں! میں آپ کی بات کا بُرا کیسے مان سکتا ہوں؟ ـــ فی الحال تو آپ
ہی میرے آقا ہیں ـــ آپ نے حکم دیا تھا اسی لئے خاموش تھا ـــ شکریہ ادا کرتا ہوں ـ
آہا ـ کیسی لطیف بُو اور مخمور کن ذائقہ ہے اس سگریٹ کا ـ طبیعت خوش ہو گئی ـ
سگریٹ تو صاحب ۵۵۵ ہی ہوتی ہے ـ
اُف بابوجی! آپ شاید اپنے ساتھ مجھے بھی پٹوائیں گے ـ یہ چپ اٹھا کر مکان کو

جھانکنے لگے ہے آپ — وہاں چند حسین لڑکیاں ہونگی اور کچھ جوان عورتیں —
عورتیں سو رہی ہوں گی۔ رات بھر محنت جو کرتی ہیں بیچاریاں! — اور لڑکیاں نھنھیاں
پہنے گھر کے کام کاج میں مشغول ہوں گی — واہ اس میں پٹنے کی کوئی بات ہی نہیں —
بابو صاحب! آپ ہی کس پھیر میں؟ — رنڈیوں کا گھر ہے تو کیا ہوا! جب تک
ان طوائف زادیوں کی نتھ نہیں اترتی یہ اتنی ہی عصمت مآب ہوتی ہیں جتنی کہ اچھے اچھے
گھرانوں کی دوشیزائیں — بلکہ بعض اوقات تو اونچے گھرانے کی لڑکیاں بھی وقتی طور
پر جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا جوہر عصمت گنوا بیٹھتی ہیں، لیکن ان طوائف زادیوں کی
بائیں اور استاد جی بڑی جانفشانی کے ساتھ ہر لمحے ان کی پاسبانی کرتے ہیں۔ کیوں
کہ انھیں اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنی ہوتی ہے۔ وہ دیکھیے! —
پردے کے پیچھے بنے استاد اس لڑکی کو گانا سکھلا رہے ہیں۔ اگر آن کو آپ جھانکتے
ہوئے دکھلائی دے جاتے تو ہم دونوں کی شامت ہی آگئی ہوتی — خیر — آئندہ احتیاط
برتنے گا —!

یہ جو اس بوڑھی عورت کے سر سے جوئیں نکلانے میں محو ہے —؟ یہ ریشماں ہے —
آج مزہ دیکھئے گا بابو جی! — کیسے ہنس ہنس کر باتیں کرے گی —!

اے ریشماں بائی! — ہاں بھائی! اب ہم غریبوں کو کیوں پہچاننے لگیں!
— اوہ! — تم نے بھی کون سا زمانہ یاد دلا دیا بائی جی! — آجکل تو ہم — یادِ ماضی
عذاب ہے یا رب — قسم کے اشعار کا وِرد کیا کرتے ہیں — وہ زمانہ ہی گذر گیا۔ جب
خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب تو منہ پہ سے مکھیاں بھی نہیں اڑائی جاتیں —
پچھلے وقت کو یاد کر کے تھوڑی سی آہیں بھر لیا کرتے ہیں — نئی نئی جوانی تھی تب —
دل میں کھلتی ہوئی امنگیں تھیں — بپھرتے ہوئے ولولے — جیبوں میں باپ کا چھوڑا
ہوا روپیہ بھرا تھا — سب کچھ تو بھینٹ بڑھا دیا تم لوگوں کی چوکھٹ پر —

بھئی ابھی نظروں میں تو تم آج بھی وہی بارہ سال پہلے والی ریشماں ہو جس پر شہر کے
تمام گبرو مرتے تھے۔ مگر بائی جی! اس وقت تو تمھارے بھی عجیب ٹھاٹ تھے۔
تب تم اونچے بالاخانے پر بیٹھا کرتی تھیں یہاں آجکل وہ جوگالی ناگن بیٹھتی ہے۔
ہزاروں کے وارے نیارے ہوتے تھے۔ اب اس سے کیا ہوتا ہے۔ میرے نہ آنے
سے تم نے یہ اندازہ کیسے کر لیا کہ محبت میں کمی آگئی ہے۔ روپیہ آئے وہ جیب میں۔
پھر وہی ہم ہوں گے اور وہی تم۔ بس اب زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ تمھاری ناک
کٹ گئی اس لئے اب صرف دو ہی روپے لیتی ہو۔ مجھ سے کچھ اور بھی کم لے لیا
کرو گی!۔ پرانا گاہک ہوں۔ نوازش ہے بائی جی تمھاری! وہ سالا شرابی
فوجی نشے میں تمھاری ناک پر دانت سے نہ کاٹ لیتا اور اسپتال میں سیپٹک نہ ہو جانے سے
تمہیں آپریشن میں ناک نہ کٹوا دینی پڑتی تو تمھارے وہی پہلے جیسے ٹھاٹ ہوتے۔
کیا کہا۔ ؟ اس کو گالی نہ دوں ؟ بھلا کیوں۔ ! تو چھوکری سے تمہیں بہت
آمدنی ہوتی تھی اس لئے۔ ؟ تو پھر کس لئے گالی نہ دوں آخر۔ ؟ وہ تو کابچہ حرامی۔
سالا فوجی کہیں کا۔ یہ ساری تباہی اسی کے کارن تو آئی ہے تم پر۔ جب تک
تم نہ بتاؤ گی اسی طرح گالی بکتا جاؤں گا۔ ۔ ۔ لے لوگی تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں نہ دوں گالی۔
اوہ! تمہیں اس سے محبت ہے اب تک۔ رنڈیاں بھی محبت کر لیتی ہیں۔ ایں
۔ کیسی محبت!۔ کیوں بناتی ہو مجھے۔ ارے یہ آیا۔ معاف کرنا بائی جی!۔
وہ میرے ساتھ والے بابو جی بھاگے جا رہے ہیں۔ پھر ملوں گا۔

اجی بابو جی!۔ میں نے کہا بابو صاحب! ذرا سنئیے تو۔ ابھی آپ نے مدتوں
شہر میں اور پبلک ردیلی کو تو دیکھا ہی نہیں۔ ایک ہوٹی بھی دوکان لگاتی ہے یہاں
جس کے سیکڑوں ہمنوال ہیں۔ اب آپ صبح کو آئے ہیں یہاں تو اس میں میری
کیا خطا ہے۔ کیا کہا آپ نے۔ کبھی ایک ایسی روشن ادا نباک صبح کو آئیں گے۔

آپ اس طرف — جب — ارے باپ رے — کیوں اپنے ساتھ ہی مجھے بھی گرفتار کروانا چاہتے ہیں! — اُف کتنے گندے خیالات ہیں آپ کے — ان فاحشہ عورتوں عصمت فروش فاحشہ عورتوں اور سماج کے سینے پر رِستے ہوئے ناسوروں کو آپ اپنی بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کا درجہ دلوانا چاہتے ہیں — ارے آپ تو بھاگتے ہی چلے جا رہے ہیں!

ارے باپ رے! میں بوڑھا آدمی — پیر میں جوتا الگ کاٹ رہا ہے" — کس طرح پیچھا کروں — او بابو صاحب! ابے او سؤر کے بچے! — اے بھیا — ارے سالے حرامزادے — سُن تو — میں نے پرسوں رات سے کھانا نہیں کھایا —!

میرا محنتانہ تو دیتا جا!

او بھیا! میں پرسوں سے بھوکا ہوں!!!

(فروری ۱۹۵۵ء)

مرنے دو

صبح ہی صبح ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے اخبار کھولا تو ایک موٹی سی سرخی نے اپنی طرف متوجہ کرلیا ——

"مُردے نے ٹھگ لیا ——

لکھنؤ۔ ۱۰ نومبر۔ ہمارا اسٹی رپورٹر قریب دہی کی ایک بڑی دلچسپ خبر دیتا ہے۔ کل شام ایک مفلوک الحال شخص سیٹھ چندامل سورج رام کی دوکان پر پہنچا اور بتایا کہ وہ ایک پردیسی ہے اور اپنے بھائی کو علاج کے لئے دیہات سے لکھنؤ لایا تھا اس کا بھائی راہی ملکِ عدم ہوگیا۔ تمام جمع پونجی وہ اپنے بھائی کے علاج پر پہلے ہی صرف کرچکا ہے اور اب لاش کی کریاکرم کے لئے اُس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ سیٹھ جی نے اپنے منشی کو ڈھائی سو روپئے دیکر اس شخص کے ہمراہ کردیا کہ جاکر کریا کرم کا انتظام کردیں۔ وہ اجنبی منشی جی کو ساتھ لے کر امین آباد کے ایک کمرے میں پہنچا۔ جہاں ایک پلنگ پر چادر سے ڈھکی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اجنبی نے منشی جی سے پیسے لئے اور سامان لانے کے بہانے چلا گیا اور منشی جی لاش کے قریب بیٹھ کر شلوک پڑھنے لگے۔ لیکن اُن کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا جب دس پندرہ منٹ بعد ہی مُردہ اُٹھ بیٹھا اور چادر لیکر

بھاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کمرہ بھی عرصے سے کرایہ کے لئے خالی پڑا تھا۔ پولیس تحقیقات میں مصروف ہے۔ ! "

میں نے جھنجھلا کر اخبار پٹک دیا۔

عرصے سے اس قسم کی وارداتیں دیکھنے، سننے اور پڑھنے میں آرہی تھیں۔ بدمعاشوں نے دھوکہ دینے کے نت نئے طریقے کھوج نکالے تھے۔ جیسے جیسے زمانہ ترقی کر رہا تھا اسی تیز رفتاری سے چور اچکے اپنے فن میں جدت طرازیاں کر رہے تھے۔ بذاتِ خود میں ان لوگوں کی چالاکیوں کا کئی بار شکار ہو چکا تھا۔ ایک دن ریلوے بک اسٹال پر کھڑا مختلف رسائل کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ ایک فیشن ایبل نوجوان تھا۔ چہرے پر بدحواسیاں رقصاں تھیں۔ میں نے رسالہ کاؤنٹر پر ڈال کر اس سے پوچھا۔

" کہیئے ـــــ؟"

وہ اکھڑا اکھڑا بولا ـــــ

" جی! میں فیروز آباد کا رہنے والا ہوں۔ غریب گھرانے کا فرد ہوں۔ تھرڈ ائیر کا طالب علم ہوں۔ یہاں جو ایئر فورس میں ٹیکنیکل کورس کے مقابلے کا امتحان ہو رہا ہے اسی میں شرکت کی غرض سے آیا تھا۔"

میں نے اس کی تقریر کو روکنے کی غرض سے کہا ـــــ

" صاحب! آپ کہہ رہے تھے نا ـــــ تفصیل میں جانے سے قبل یہ بتلایئے آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

" نہیں صاحب!" وہ جلدی سے مطلب پر آتا ہوا بولا ـــــ " میں دراصل چاہتا تھا کہ ...... کہ آپ میری کچھ مدد کر دیتے۔ ریکروٹنگ آفیسر نے چار دن کے لئے بلوایا تھا لیکن امتحان کے لئے آٹھ دن رکنا پڑا۔ پھر بھی مجھے بھرتی نہیں کیا۔

کہتے ہیں میرا سینہ کم ہے۔ جو کچھ گھر سے لایا تھا سب ختم ہو چکا ہے۔ کل صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ گھر خط لکھے لیکن جواب نہیں آیا اب تک ۔۔۔ والدین بھی پریشان ہونگے۔ کالج کی غیر حاضریاں بھی ہو رہی ہیں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ شریف ہوں۔ بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے خوف آتا ہے کہ جیل جانے کی نوبت نہ آجائے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میرا ہاتھ بے اختیار جیب میں چلا گیا۔ رسالے خریدنے اور متفرق اخراجات کے لئے جیب میں چودہ روپے چھ آنے پڑے تھے، اُسے تھماتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں میں نے کہا ۔۔۔۔

"معاف کیجئے گا۔ میرے پاس اس وقت یہی کچھ ہے۔ مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے۔ خدا آپ کی مدد کرے ۔۔۔۔"

اُس نے اطمینان کے ساتھ نوٹ گن کر جیب میں رکھتے ہوئے مجھے مشکور نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگا ۔۔۔۔

"آپ انسان نہیں، فرشتہ ہیں۔"

"ظاہری رسمیں نہ برتنے دیجئے۔ یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا۔"

میں اپنا پسندیدہ پرچہ جو خریدنے کے لئے الگ رکھا تھا، وہیں بک اسٹال پر واپس رکھ کر چلا آیا۔ پھر اس ماہ میں کوئی رسالہ نہ خرید سکا۔ ضروری اخراجات پر بھی کافی کنٹرول رکھنا پڑا کیونکہ اس مد کے روپے تو میں فرشتہ بننے پر صرف کر چکا تھا۔ اور پھر کچھ دنوں بعد ......

"بصرہ ریسٹورانٹ" میں ناشتہ کرتے ہوئے میری نظر مقابل کے سنگ مرمر کے ٹیبل کو گھیرے بیٹھے ہوئے فیشن ایبل نوجوانوں کی ٹولی پر جا پڑی۔ انہیں میں وہ نوجوان بھی تھا جس نے اسٹیشن پر خود کو فیروز آباد کا مصیبت زدہ انسان ظاہر کر کے مجھ سے چودہ روپے چھ آنے اینٹھ لئے تھے مجھے قہر آلود نگاہوں سے خود کو گھورتے پا کر وہ بڑے سکون کے ساتھ مسکرا دیا اور جھکی ہوئی آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔

"یہ حضرت، جو ناشتہ کر رہے تھے —— انسان نہیں ہیں !"

"پھر —— ؟" ساتھیوں میں سے کئی ایک نے سوال کیا۔

"فرشتہ ہیں !" وہ بولا اور میز پر جھک کر جلدی جلدی کچھ کہنے لگا۔ شاید اس نے نمک مرچ لگا کر اسٹیشن والا واقعہ سُنایا تھا۔ پھر وہ سب زور زور سے قہقہے لگانے لگے اور میں خجل ہو کر ناشتہ ادھورا ہی چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا۔

اور پھر مجھے وہ خوبصورت عورت یاد آئی —— میں ٹیوشن پڑھا کر گھر واپس پلٹ رہا تھا۔ رات کے کوئی دس بجے ہونگے۔ برفیلی ہوائیں سائیں سائیں کرنے لگی تھیں۔ میں اپنے اکلوتے پُرانے اور شکستہ جیسٹر کو سینے سے چمٹائے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا کہ اچانک رُک جانا پڑا تھا —— پیچھے سے کسی نے بڑی ہی سُریلی آواز میں التجا کی تھی ——

"اے مسٹر! ذرا سُنئے ——"

اور ایک لمحہ بعد ہی وہ مجھ سے آملی تھی ——

"میں اس شہر میں اجنبی ہوں ——" اس نے کہا تھا —— "دِلّی کے مشہور صرّاف سیٹھ فلاں کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ انٹرمیڈیٹ پاس کر چکی ہوں۔ مجھے بچپن ہی سے فلموں کا بے حد شوق رہا ہے اور فلم ایکٹریس بننے کی تمنا رہی ہے۔ میرے ایک بوائے فرینڈ نے مجھے بتایا کہ ایک مشہور فلم ڈائرکٹر اپنی فلم کے لئے نئی ہیروئن کی تلاش میں بڑے بڑے شہروں کا دورہ کر رہا ہے اور آجکل کانپور میں ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا، میں اپنے زیور، کپڑے اور تقریباً ساڑھے سات ہزار روپیہ لیکر اس کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ ہم یہاں "پرنسس لاجنگس" میں ٹھہرے۔ بہت دنوں تک وہ مجھے طرح طرح کے بہانے بنا کر ٹالتا رہا اور پھر ایک دن مجھ سے روپے لے کر ڈائرکٹر سے ملنے گیا تو آج تک لوٹ کر نہیں آیا۔ میں اب تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن اب لاج والوں نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔ مجھ سے بل کی ادائیگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ میرے پاس نقد ایک پائی نہیں۔ زیور میں بیچنا نہیں چاہتی۔ کہ گھر والوں

کو کیا جواب دونگی۔ آج جب اُن لوگوں نے بہت پریشان کیا تو سونے کا یہ کڑا لیکر نکلی ہوں۔
اُس نے ہینڈ بیگ سے ایک کڑا نکال کر مجھے دکھایا اور اپنی داستان جاری رکھتے
ہوئے بولی ______

"...... سوچا تھا کسی صراف کے ہاں رہن رکھدوں گی اور دہلی پہنچ کر روپے
بھیج کر منگوالوں گی لیکن کوئی راضی نہیں ہوتا۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ خریداری کی رسید دکھلاؤ
اور کچھ اتنی کم رقم دیتے ہیں کہ ہوٹل کا بل بھی ادا نہیں ہو سکتا ______ سخت پریشانی ہے۔
آپ صورت شکل سے شریف معلوم ہوتے ہیں اس لئے روک کر آپ کو یہ طویل داستان سُنادی
ہے ______ خدا کے لئے مجھے اس دُکھ سے نجات دلوائیے۔ اگر جلد ہی گھر نہ پہنچ گئی تو کہیں
کی نہ رہ جاؤں گی ______ لوگوں میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہوں گی۔ ابھی تو خیر بہانہ
کردوں گی کہ اپنی سہیلی کے یہاں چلی گئی تھی شادی کے سلسلے میں ______ بھگوان کے لئے
آپ مجھے سہارا دیجئے۔"

وہ میرے شانے پر سر رکھ کر سسکنے لگی اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پگھل کر
میں نے پوچھا ______ "کتنے کی ضرورت ہے آپ کو ؟"
"جی ڈیڑھ سو روپے میں کام چل جائے گا ______" اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
میں نے گھر سے لاکر ڈیڑھ سو روپے، جو چھ ماہ سے ایک ایک پیسہ کرکے جمع
کر رہا تھا، اُس کی نذر کئے اور جب وہ شکریہ ادا کرنے لگی تو میں نے کہا ______
"اس میں شکریے کی کیا بات ہے ؟ یہ تو میرا فرض تھا۔ اور آپ ضمانت کے طور پر
اپنا سونے کا کڑا ابھی تو میرے پاس چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ روپے میرے ٹرنک میں پڑے تھے
چند دِنوں بعد آپ بھیج ہی دیں گی۔ آپ کا فی الحال کام نکل رہا ہے تو کیا بُرائی ہے ؟"
اس نے ممنون نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور جب وہ رخصت ہونے لگی تو
میں نے اُس کے سُرخ سُرخ لبوں کا بوسہ لے لینا ضروری سمجھا ورنہ یہ ایک نوجوان

دوشیزہ کی توہین ہوتی۔

اور پھر اس واقعہ کے چوتھے دن مونگنج سے ریحانہ شبنم کے کوٹھے سے گانا سُن کر واپس آرہا تھا کہ مجھے اس کی ایک جھلک نظر آگئی ——— وہ کسی گاہک سے سودا طے کر رہی تھی ———

"رات بھر یا ——— ؟"

"نہیں ——— رات بھر!"

"پندرہ روپے........"

"اخاہ! ایسی کہاں کی پری ہو؟"

میں آگے بڑھ گیا۔ دل و دماغ میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ تو یہ تھی دہلی کے سیٹھ فلاں کی اکلوتی بیٹی!

میں نے گھر پہنچ کر اس کا سونے کا کڑا نکالا۔ اب اس کی میرے پاس کوئی ضرورت نہ رہ گئی تھی۔ دوسرے دن صرافے سے اس کے تین روپے پانچ آنے مل گئے۔ کیونکہ چاندی کا تھا۔ سونے کا تو صرف ملمع تھا اس پر ——— اس طرح ایک سو چھیالیس روپے گیارہ آنے کی چپت پڑی مجھ پر ——— لیکن نہیں بھولتا ہوں ——— میں نے ایک بوسہ بھی تو لیا تھا اس کا ——— ایک طوائف کا بوسہ ——— ایک سو چھیالیس روپے گیارہ آنے ہیں!

اور وہ پھر وہ معین ———!

کیا وہ اس طوائف سے کچھ کم دغاباز تھا ———— ؟

کمبخت سے میری بچپن کی دوستی تھی۔ کیا خبر تھی کہ مجھ ہی سے داؤں کھیلے گا۔ ایک دن صادق صدیقی سردھنوی کا ناول "سنگدل ملکہ" پڑھ رہا تھا کہ وہ آدھمکا ———

"کس مصنف کی کتاب ہے؟"

"صادق صدیقی کی ——— سنگدل ملکہ!"

"یار! تو مولانا کی کتابیں نہ پڑھا کر!"

"کیوں ــــــ ؟"

"یہ کتابیں مسلمانوں کے لئے ہیں!"

"اچھا ــــــ! تو گویا ہم کافر ہیں؟"

"اوہ! تو آپ خود کو مسلمان سمجھتے ہیں؟" وہ ابل پڑا ــــــ "کون سا کام کیا ہے تو نے اسلام کے حق میں؟ عید کے عید نماز پڑھ لینے ہی سے تو کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا ــــــ"

"تو پھر مسلمان بننے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟" میں نے پوچھا۔

"نکال پچیس روپے ــــــ کچھ تو کارِ خیر کر ــــــ محلے کی مسجد شکستہ حالت میں ہے، اگر ابھی سے مرمت نہ کرائی گئی تو دو ایک سال میں بالکل کھنڈر ہو جائے گی ــ"

"لیکن یار! محض پچیس سے کیا ہو گا؟"

"شروع کر دیئے نا حیلے بہانے! ــــــ رسیدیں چھپوائیں گے ان پیسوں سے چندہ وصول کرنے کے لئے۔ چل اب جلدی کر ــــــ مجھے پریس جانا ہے۔"

مجبوراً دینے پڑے۔

دوسرے دن اُس نے چھپی ہوئی رسیدوں کا بنڈل لا کر مجھے دکھایا اور پھر روز احباب بتاتا رہا ــــــ

"آج گھسیانہ سے چالیس روپے ملے۔"

"مصری بازار سے ڈیڑھ سو روپے وصول ہوئے۔"

"بابو پورہ سے ایک سو ساٹھ وصول پائے۔"

"شفیع آباد والوں نے تین سو پانچ روپے دیئے۔"

اور اس طرح اُس نے تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ مسجد کے لئے اکٹھا کر لیا۔

پھر اُس کی لڑکی کی شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ شادی ختم ہو جانے پر

ایک دن موقع پاکر میں نے اس سے دریافت کیا

"معین بھائی! مسجد کی مرمت کب ہوگی؟"

"کس مسجد کی؟" اُس نے متعجبانہ لہجے میں سوال کیا۔

"وہی جس کے بارے میں تم کہہ رہے تھے کہ فوری مرمت نہ ہوئی تو دو ایک سال میں کھنڈر ہو جائے گی"

اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا ــــــ

"یار! تو بھی عجیب ہے۔ بھلا ایسی کون سی مسجد ہے اپنے محلّے میں؟"

میں کبھی نماز پڑھنے گیا ہوتا تو اُسے بتاتا ــــــ پوچھا ــــــ

"پھر وہ چندہ کس لئے جمع کیا تھا؟"

"لونڈیا کی شادی کے لئے ــــــ ایک اچھی جگہ سے پیغام آگیا تھا۔ سوچا اس کام سے بھی فارغ ہو لوں!"

اور میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

اور آج یہ سب واقعات رہ رہ کر یاد آرہے تھے۔ اور میں اس مکّار و پُرفریب دُنیا کی اخلاقی گراوٹ پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اچانک یاد آیا کہ کل رات کو جس تازہ افسانے کا مسودہ صاف کیا ہے اُسے رجسٹری سے رسالے کے دفتر روانہ کرنا ہے باقی ماندہ ٹھنڈی چائے ایک گھونٹ میں اندر انڈیلی۔ جلدی سے کاؤنٹر پر آکر بل چکایا اور جیب کا جائزہ لیا۔ جیب میں صرف بارہ آنے بچ رہے تھے۔ یعنی صرف اتنے پیسے کہ کہ افسانہ رجسٹری سے بھیج سکوں۔ اور پھر شام سے اُدھار کھانے اور پینے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا اور پھر قرض کا پہاڑ آنے والے ماہ کی پہلی تاریخ کو مسکرا مسکرا کر میرا استقبال کرے گا۔

انھیں خیالات میں کھویا ہوا فٹ پاتھ پر بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک کسی نے

پاؤں پکڑ لئے۔ میں گرتے گرتے بچا۔ غصّے سے اس طرف دیکھا۔ پھٹے چیتھڑے پہنے ایک بدصورت سیاہ فام بھکارن جس کی آنکھیں اندر دھنسی جارہی تھیں، ایک گھناونے مگر وہ بچے کو لئے بیٹھی تھی۔ بچے کی گردن لٹکی پڑ رہی تھی شاید بیمار تھا ــــــ میں نے جھنجھلا کر کہا ــــــ

"یہ کیا بدتمیزی ہے ؟"

"بابوجی ــــــ!" بھکارن کی آواز بمشکل نکل رہی تھی ــــــ "میرا بچہ ــــــ میرا لال ــــــ چھ آنے سرکار ــــــ دوا لاؤں گی ــــــ"

میں نے ایک نظر بچے کو دیکھا۔ ہاتھ جیب میں پہنچ چکا تھا۔ اچانک یاد آیا کہ وہاں تو صرف بارہ آنے ہیں اور گھر پر ایک افسانہ تیار پڑا ہے جسے آج ہی رجسٹری سے بھیج دینا ہے اور پھر آج کا اخبار، وہ فیروزآباد کا مصیبت زدہ نوجوان اصراف کی طوائف بیٹی اور معین الدین بھی یاد آگئے ــــــ میں نے جلدی سے ہاتھ جیب سے نکال لیا اور آگے بڑھنے لگا۔ بھکارن نے پھر پیر پکڑ لئے ــــــ

"بابوجی! صرف چھ آنے ــــــ میرا لال مرجائے گا!"

"مرنے دو!"

میں اُسے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

دو دن بعد اُسی سڑک سے پھر گذر ہوا۔ دیکھا وہی بھکارن اپنے بچے کی گھناونی لاش کو سینے سے چمٹائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ قدم منوں وزنی ہو گئے۔ محسوس ہوا کوئی انجانی آواز میرے کانوں کے پاس مسلسل چیخ رہی ہے ــــــ

"بابوجی ــــــ صرف چھ آنے ــــــ میرا لال مرجائے گا!"

(مئی سنہ ۱۹۵۲ء)

دیدۂ حیراں

منیزا! اپنی آنکھیں بند کرلو ورنہ آسمان پھٹ پڑے گا۔

اپنے باپ کے صبر و ضبط کا امتحان نہ لیجئے! خدا کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلو۔
دیکھو منیزا! تمہاری بن بیاہی ماں جس کار میں سفر کر رہی ہے وہ میلوں دور نکل گئی۔
اور اب تو اس کے تعاقب میں سر دھنتی ہوئی خاک بھی تھک کر بیٹھ گئی ہے۔ بیٹا! اب
تو اپنی ننھی منی حیران آنکھیں اس طرف سے ہٹا لو۔ مجھے دیکھو بیٹا! حیران تو مجھے ہونا
چاہیئے کیونکہ میں نے اس عالم عجائبات کو پورے چالیس سال تک دیکھا ہے اور خوب
گہرائیوں میں اتر کر دیکھا ہے۔ فرطِ حیرت سے میری آنکھوں کو پھٹ جانا چاہیئے لیکن میں
ہوں کہ آنکھوں میں آنسو لئے تمہارے پاس بیٹھا ہوں اور تم ہو کہ اپنی بے اندر آنکھوں سے
ٹکر ٹکر اس طرف تکے جا رہے ہو۔ بیٹے! میں بھی حیرانیوں کے دور سے گزرا ہوں۔ کئی بار
میری ویران زندگی پر بھی حیرانیوں نے پورے زور و شور سے حملہ کیا ہے اور میرے ہوش
و حواس گم ہوگئے ہیں۔ لیکن میں تمہاری طرح ٹکٹکی لگا کر ان سے آسمان کو تاکتا

نہیں رہ گیا۔

معلوم نہیں تم میری جگہ ہوتے تو تمہاری کیا حالت ہوتی۔ وہ میرا تیسرا فاقہ تھا مجھے ملازمت سے جواب مل چکا تھا۔ اپنا حق تسلیم کرانے کی کوشش باغی ہونے کی دلیل سمجھی گئی تھی اس لیے دوسری جگہ نوکری حاصل کرنے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی تھی لیکن تمہارے باپ کی سرشت میں ناکامیوں سے مرعوب ہونا شامل نہیں۔ اس لیے میں اس دن تمہارے ماموں کے دفتر میں جا نکلا تھا۔ میں حیران ہو کر کہتا ہوں حیرانی کس بات کی ہے۔ تم نے ابھی سولہ سال کی عمر میں دیکھا ہی کیا ہے۔ اپنے ماموں کے دفتر میں پہنچ کر تم حیران ہوتے تو کوئی بات تھی لیکن مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی وہاں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر۔ اتنی عالیشان بلڈنگ کے مالک کا دفتر جیسا ہونا چاہیے ویسا ہی تھا۔ فرش پر قیمتی دبیز قالین، چمکیلے فرنیچر کی افراط، جس میں دس بارہ حسین ٹائپسٹ لڑکیاں بھی شامل تھیں اور نہ جانے کیا الا بلا اس کمرے میں تھی لیکن میں تو بھوک سے ہلکان تھا حیران کہاں سے ہوتا۔ سیدھا جا کر تمہارے ماموں کے پیروں پر گر پڑا۔ سچ کہتا ہوں بیٹے! تم اپنے ماموں کو دیکھتے تو مجسمہ حیرت بن جاتے۔ یہ بڑی قابل رشک بات ہے کہ وہ بھی اسی قد و قامت کے ہیں اور شاید اسی رعایت سے گاندھی اکیڈمی نام سے کہلاتے ہیں۔ بے تحاشہ قسم کے دولتمند ہیں لیکن عام امیروں کی طرح کنجوس نہیں۔ بڑے نرم دل ہیں اور بڑی دریا دلی سے راشٹریہ سیاسی پارٹیوں کو چندہ دیتے ہیں۔ اس دن جب میں ان کے قدموں پر گر پڑا تو تھوڑی دیر تک تو انہوں نے تلوے میں لپٹا رہنے دیا

اور جب میں نے اپنی گردن اٹھائی تو مسکرا دیے —

"میرا خیال ہے گرمی زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔"

میں نے کہا —

"میں آرام نہیں کام چاہتا ہوں۔"

پوچھا ـــ

"اب تک کیا کرتے رہے؟"

"برسوں تک ایکس وائی کاٹن مِل میں کلرک تھا' اب فاقے کر رہا ہوں۔"

"کوالیفکیشن؟"

"گریجویٹ ہوں۔"

"وہاں سے استعفیٰ کیوں دے دیا؟"

"جی۔ استعفیٰ نہیں دیا۔ بونس حاصل کرنے کے لئے ہڑتال کی تحریک چلانے کے جرم میں نکال دیا گیا ـــ"

"پھر میں تمہیں اپنے مِل میں کیسے رکھ سکتا ہوں؟" تمھارے ماموں نے کہا۔ مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ یقین تھا یہی جواب ملنے والا ہے' لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ باہر جانے لگا۔

"ذرا سُنئے!" پیچھے سے تمھارے ماموں نے آواز دی۔ تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو بولے ـــ

"یہ پانچ روپے لیتے جائیے اور شام کو مجھ سے گھر پر ملئے گا ـــ"

اُس دِن جیب میں اکٹھے پانچ روپے آئے تو تاؤ میں آ گیا پورا ڈیڑھ روپیہ اُڑ گیا۔ پورے چھ آنے دے کر حجامت بنوائی اور ایک دم ڈھائی روپے کی چپلیں خرید ڈالیں کیونکہ پرانے جوتے نوکری کی تلاش میں دیدۂ حیراں بن چکے تھے۔ پھر شام کو بن سنور کر گاتا ہوا تمھارے ماموں کی کوٹھی پر پہنچا۔ کیونکہ پیٹ میں میٹھا میٹھا درد تھا پیٹ بھرا تھا اس لئے دو رات منزلہ عظیم الشان عمارت دیکھ کر حیران بھی ہوا اور یہ جان کر مزید تعجب ہوا کہ اس عظیم الشان عمارت میں صرف تمھارے ماموں اور تمھاری ماں رہتے ہیں مجھے تمھارے ماموں کے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں اُن کے ساتھ ایک غیر معمولی طور پر صحتمند

قسم کی ایک عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی جس کی پیشانی اگرچہ اور چوڑی ہوتی اور آنکھیں اتنی چھوٹی نہ ہوتیں تو حسین کہی جا سکتی تھی۔ عمر یہی ستائیس اٹھائیس سال ہوگی۔ غیر معمولی جنسی کشش کی حامل تھی۔ چہرے پر غضب کی معصومیت تھی۔ مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ تمھاری ماں تھی۔

"یہ میری چھوٹی بہن شاہدہ ہے" تمھارے ماموں نے بتلایا۔ "میں نے تمھیں یہاں اس لئے بلایا ہے کہ شاہدہ کو ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ شادی کے چھ مہینے بعد ہی شریمتی نے اپنے شوہر کو طلاق دینے پر مجبور کر دیا۔ جس کا ایک ہی سبب سمجھ میں آتا ہے کہ اسے ادب سے لگاؤ ہے۔ شاید گھر گرہستی کی اُلجھنوں میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ سات سال سے اُردو ادب کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ اب انگریزی اور ہندی کی بھی خبر لینا چاہتی ہے۔ آپ اسے ٹیوشن دیجئے میں آپ کو معقول تنخواہ دوں گا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے فوراً حامی بھرلی

"بہتر ہے۔ کب سے حاضر ہو جاؤں۔؟"

"کل ہی سے بسم اللہ کر دیجئے۔" تمھارے ماموں نے کہا۔

اچانک تمھاری ماں نے، جو شروع سے اب تک خاموش رہی تھی، دریافت کیا۔

"کیا آپ کسی اسکول میں ماسٹر ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ایک مِل میں کلرک تھا، نکال دیا گیا۔"

"تو فی الحال آپ بیکار ہیں؟"

"جی یہ ٹیوشن مِل جانے کے بعد بیکار نہیں رہا!"

اس نے اپنے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو پھر آپ کہیں اور نوکری نہ کیجئے گا۔ آپ کو مِل سے جو تنخواہ ملتی تھی ہم پیش کریں گے۔"

اور پھر کچھ سوچ کر بولی ــــ

"آپ رہتے کہاں ہیں ؟"

میں ہنسنے لگا۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا ــــ

"کیوں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟"

میں نے کہا ــــ

"کھانا ہوٹل میں کھا لیتا ہوں، سوتا فٹ پاتھ پر ہوں ۔"

"یہ کیا بات ہوئی ؟"

"جی ہاں، بمبئی میں ایسی ان ہونی بات مجھ جیسے بہت سے کرتے ہیں"

بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تو تمہارے ماموں نے کہا ــــ

"خیر کوئی بات نہیں ـــــ آپ کو نچلی منزل میں ایک کمرہ دے دیا جائے گا۔ اس طرح شاہدہ بھی آپ سے زیادہ بہتر طور پر مستفید ہو سکے گی ۔"

تو منّے ! اس طرح میں تمہاری ماں کے قریب پہنچا اور ڈیڑھ سال تک اُن کے قریب رہا۔ اس ڈیڑھ سال میں مجھے بہت کچھ معلوم ہوا۔ تمہاری ماں نے اپنے پہلے شوہر سے چھ ماہ بعد اس لئے طلاق لے لی تھی کہ وہ ایک اچھا رفیقِ حیات تو تھا لیکن شوہر کسی کرنے سے نہ تھا اور تمہارے ماموں نے اب تک شادی کیوں نہ کی تھی یہ بھی ایک کھلا ہوا راز تھا۔ تمہارے ماموں نے اس وقت تک تمہاری ماں کی شادی اس لئے نہیں کی تھی کہ اُن کے خاندان میں اُس وقت تک کسی لڑکی کی شادی دو بار نہیں ہوئی تھی۔ اور تمہاری ماں میں جنسی کشش بہت تھی اور اس میں جنسی بھوک نے بڑی طرح اُتھل پتھل مچا رکھی تھی۔ چنانچہ تمہاری ماں کا مجھ ایسے مرد کے قریب آنا جسے چالیس سال تک معاشرے نے عورت کے قرب سے محروم رکھا تھا، صرف ایک بات کی طرف اشارہ تھا جو میں کر رہی۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے ۔ اگر سماج اور زمانے

نے ہمیں بھنی کی طرف سے بھوکا رکھا تھا تو ہم چُرا کر کھانا کھائیں گے پیٹ بھرنا گناہ نہیں۔ چنانچہ
تمہاری ماں کا پیٹ بھر گیا۔ میں گھبرایا لیکن وہ عجیب دل گُردے کی عورت تھی۔ انجام سے
بے پروا۔ تمہارے تصور میں کھوئی رہتی۔ میں نجات حاصل کرنے کی تدبیریں بتاتا تو میری طرف
ایسی خشمناک نظروں سے دیکھتی کہ میں لرز کر رہ جاتا۔ میری حالت پر غور کرو بیٹے! وہ مدت
جو تم نے اپنی ماں کے پیٹ میں گزاری ہے میرے لئے سوہانِ روح رہی ہے۔ تمہارے ماموں
کو حقیقت کا علم ہوا تو وہ مجھے گولی مار دینے پر تل گئے۔ لیکن اس طرح تو واقعہ اور شہرت
پکڑتا۔ لہٰذا بیٹا! مجھے پانچ ہزار روپیہ دے کر پونا روانہ کر دیا گیا۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا؟
مُہرے کا کام ہے اُسے جہاں اُٹھا کر رکھ دیا جائے، رکھا رہے اور جب ہٹایا جائے، ہٹ جائے۔
میں ہٹ گیا۔ پانچ ہزار جیب میں تھے، دل میں رنج و غم کا طوفان، سر میں پراگندہ خیالات
کا بوجھ ـــ میں نے پونا کے چکلے اور شراب خانے خوب خوب آباد کئے۔ جتنی ساقی سے پی
پی کر سیراب ہو چکا تھا۔ اب ساغروں سے پینے لگا۔ سات آٹھ ماہ پونا میں گزرے اس زندگی
کا عادی ہو چلا تھا کہ ایک اور گُل کھلا۔

آج صدر اسپتال کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ تمہارے ماموں باہر نکلتے ہوئے دکھائی
دیے۔ میں ایک دکان میں چھپ گیا اُن کے گزر جانے پر تجسس نے اسپتال کے دروازے
تک پہنچا دیا۔ دس روپیوں نے ریکارڈ اور رجسٹر کھول کر سامنے رکھ دیئے۔ تب وہ سلطان
زندگی جو چالیس دن سے اسپتال میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ریکارڈ میں سیٹھ امیر چند کے سرٹیفکیٹ کی
نقش بھی چسپاں تھی جسے دیکھ کر شاید تم تصویر حیرت بن جاتے کیوں کہ اس میں شاہد کے
شوہر کی جگہ میرا نام درج تھا۔ مجھے سرٹیفکیٹ میں مجھ ... ہوا چہرہ وہ تو دل کے
نظر آئے۔ لیکن پوری کوشش کے باوجود میں اُس کمرے تک نہ پہنچ سکا جس میں تم اپنی ماں
کے ساتھ موجود تھے۔ تم سوا ماہ کے بچے میری اس کیفیت کا کیا اندازہ کر سکتے ہو۔ میں، جو
چالیس سال تک ایک گھر کے لئے بھٹکتا رہا ہوں۔ جب سماج نے شوہر ہونے کے باوجود شوہر

تسلیم نہیں کیا اور جو ایک بچے کا باپ ہونے کے بعد بھی اپنے بیٹے سے دور رہتا۔ تمہارے دیدار کی خواہش نے خوف و ہراس کا ہر جذبہ میرے دل سے دھو ڈالا اور میں تن کر اسپتال کے دروازے پر کھڑا ہو گیا کہ تمھارے ماموں کے پلٹنے پر آن سے تمھارے دیدار کی بھیک مانگوں گا۔ ممکن ہوا تو تمہیں مانگوں گا، تمھاری ماں کو مانگوں گا۔ وہ تقریباً چار گھنٹے بعد اسٹیشن ویگن پر واپس پلٹے۔ میں نے آگے بڑھ کر انھیں روکنا چاہا۔ لیکن وہ قدم جنھیں چالیس سالوں سے دوسروں کے احکام پر اٹھنے کی عادت تھی اٹھ نہ سکے۔ شدتِ جذبات نے زبان تھام لی اور میں بُت بنا کھڑا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر واپس لوٹتے ہوئے نظر آئے اُن کے پیچھے سیاہ بُرقعے میں کوئی فربہ اندام عورت تھی اور بُرقعے کے اندر عورت کے سینے سے لگی ہوئی کوئی چیز کُلبلا رہی تھی۔ میرا دل سینے میں دھڑکنے لگا۔ دماغ نے بیٹا بیٹا کی گردان شروع کر دی اور میں اس کیفیت سے اس درجہ مخمور ہوا کہ موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز سے قبل محویت ہی نہ ٹوٹی۔ اور جب میں نے شاہدہ کا نام لے کر زور سے چیخ ماری اس وقت تک اسٹیشن ویگن اسپیڈ پکڑ چکی تھی۔ پھر مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں کہ میں کیسے ایک چلتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھا۔ ڈرائیور کے سامنے بے تحاشہ نوٹ پھینک پھینک کر اسٹیشن ویگن کا تعاقب کرنے کی التجا کر رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی برق رفتاری کے بعد جب وہ اسٹیشن ویگن اس پل پر رکی ہوئی نظر آئی تو میری جان میں جان آئی۔ لیکن جب تک میں ٹیکسی سے اُتر کر اسٹیشن ویگن تک پہنچا اس وقت تک تمھارے ماموں تمہیں پھینک چکے تھے۔ تمھاری ماں پاگلوں کے سے انداز میں مجھے تک رہی تھی اور پھر اسٹیشن ویگن سن سے نکل گئی اور دھیرے دھیرے اس کے پیچھے سر دھننے والی گرد بھی تھک ہار کر بیٹھ گئی اور تم ہو کہ پل کے نیچے اس گندے نالے کے کنارے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے پڑے ہو اور تمہاری آنکھیں ٹکٹکی لگا کر اسی سمت دیکھ رہی ہیں!

منّے! خدا کے لئے اس طرح حیرانی سے اس طرف ٹکٹکی لگا کر نہ دیکھو تین بلوں کے مالک اس نامرد انسان کو کیا معلوم کہ تم میرے لئے کیا تھے۔ منّے! میرے بیٹے! تم میری طرف

دیکھو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم میری ناکام آرزو ہو۔ اُف میرے خدا! یہ سُن کر بھی تمھاری آنکھیں کھُلی کی کھُلی ہیں!

لیکن آہ! اب میں سمجھا تم کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ اچھّا تو بیٹا! میں تمھاری ان کھُلی ہوئی ننھّی مُنّی آنکھوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب شاہدہ کے پیٹ سے پیدا ہونے والا تمھارا چھوٹا بھائی کبھی گندے نالے کے کنارے خاک و خون میں لتھڑا ہوا پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسمان کی طرف نہیں تاکے گا۔ وہ میری گود میں ہُمکے گا۔ تم نے سُنا بیٹا! میں اس آسمانی باپ کی طرح سنگدل نہیں ہوں جس کا بیٹا اُس کی نگاہوں کے سامنے صلیب پر چڑھا دیا گیا اور وہ دیکھتا رہا۔ اے میرے چالیس دِن کے مسیح! تیری قربانی نے ایک مُردہ دِل میں رُوح پھونک دی ہے، اُمید کا ایک دیپ جلایا ہے اور اب اس دیپ سے کئی دیپ جلیں گے، اُمید کی ہزاروں مشعلیں روشن ہوں گی۔ تو اب میں تمھاری ان کھُلی ہوئی آنکھوں پر الوداعی بوسے دیتا ہوں اور بیٹا خدا کے لئے ان بوسوں پر اعتماد کر کے تم اپنی آنکھیں بند کر لینا ورنہ پھر حشر یہیں سے اُٹھے گا!

(جولائی ۱۹۵۸ء)

بھکاری

"شوفر ـــــــ!"

تین نوکر عمارت کے مختلف گوشوں سے دوڑتے ہوئے آئے اور ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

"کہاں مر گیا شوفر؟"

"جی! اس کی ماں کی حالت آج زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ خیراتی اسپتال میں بھرتی کرنے گیا ہے۔" بوڑھے نوکر نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"ہوں ـــــــ! آتے ہی اُسے میرے پاس بھیجو ـــــ"

حکم صادر فرما کر فہیم سیٹھ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اندر مسہری پر بیٹھی ہوئی نیم عریاں اینگلو انڈین دوشیزہ جس کی بہکی ہوئی نگاہیں اور آنکھوں میں پڑے ہوئے سُرخ سُرخ ڈورے حد سے زیادہ مخمور ہونے کی غمازی کر رہے تھے۔ ڈگمگاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"واٹس میٹر؟ ڈارلنگ!"

"ابھی کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔" اور اُن کے لہجے کی خفگی کسی نامعلوم طریقے پر نرمی میں تبدیل ہوگئی۔

"اوہ ــــ لیکن ......" دوشیزہ نے پریشانی کا اظہار کیا۔

سیٹھ نے بڑھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنی طرف کھینچ کر زور سے کھینچا۔ وہ لچک کر کسی شاخِ ثمر بار کی طرح دوہری ہوگئی اور اس کی نیلگوں آنکھیں کچھ اور بھی مخمور نظر آنے لگیں۔ فرطِ جذبات سے سیٹھ صاحب کی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ اُنھوں نے اُس کے سُرخ سُرخ رسیلے اور دبیز ہونٹوں کو ایک بار اور چوڑا اور اُسے مسہری کی طرف کھینچنے لگے۔

"نہیں ــــ اب نہیں۔" لڑکی نے بڑے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"اتنی گھبراہٹ کاہے کی ہے میری جان!"

"ڈیڈی کے دفتر سے آنے کا وقت ہوگیا ہے۔"

"ابھی شوفر موجود نہیں ہے ــــ تھوڑی دیر اور ......" سیٹھ نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اُسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"کہاں چلا گیا ــــ؟" لڑکی کے لہجے سے اضطراب ٹپک رہا تھا۔

"ماں بیمار ہے اُس کی ــــ" سیٹھ نے بیزاری کے ساتھ کہا ــــ "اسپتال گیا ہے۔"

"اوہ ــــ!" لڑکی کھوسی گئی۔

سیٹھ صاحب اس کی زلفوں سے کھیلتے رہے اس کے رسیلے ہونٹوں کے شہد اور گلابی گالوں کے رس سے محظوظ ہوتے رہے اور وہ کسی حسین لیکن بے جان مجسّمے کی طرح ویسی ہی کھوئی سی بیٹھی رہی۔ سیٹھ صاحب اُس کی سرد مہری سے اُدب گئے۔

"ڈیر! کیا زیادہ چڑھا گئیں ــ ــ؟"

"آں ـــ ؟" وہ چونک کر بولی۔

"میں نے کہا بہت زیادہ پی لی کیا؟"

لڑکی کے ہونٹوں کے گوشے کپکپائے اور جواب میں ایک پھیکی مسکراہٹ ٹوٹ کر بکھر گئی۔

"اِتنی کھوئی ہوئی سی کیوں ہو ـــ؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"نہیں تو ـــ" لڑکی نے اپنی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اُس کی آنکھوں میں ستارے سے لرز رہے تھے۔ وہ بھیگی بھیگی سی نیلگوں آنکھیں جن میں لال ڈورے تیر رہے تھے۔ سیٹھ فہیم کو پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ پیاری لگیں اور انھوں نے جھک کر اُن آنکھوں کو چوم لیا اور پھر اُن کی نیلی گہرائیوں میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ـــ

"کون ہے ـــ؟" سیٹھ کی آواز میں رعونت اور تمکنت تھی۔

"جی سرکار ـــ میں ہوں شاہد!" کانپتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

سیٹھ فہیم غصّے میں لپکتے ہوئے باہر آئے ـــ

"کہاں غائب رہا سُوّر!"

"حضور میری ماں ـــ" سُوّر نے کہنا چاہا لیکن اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔

"مر جائے سالی ـــ ڈیوٹی از ڈیوٹی!"

"حضور!"

"چُپ رہ کمینے! حرام خور!" انھوں نے اپنی پوری قوت سے شوفر کے بائیں گال پر چپت جمایا۔ کمینہ حرامخور بُت بنا چپ چاپ کھڑا رہا اور سیٹھ صاحب اپنا ہاتھ سہلانے لگے۔ اُسی وقت اُنھیں اپنے شانے پر لطیف سا دباؤ محسوس ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو لڑکی باہر نکل آئی تھی۔ سیٹھ فہیم کی آنکھیں جو ابھی تک شعلے برساتی رہی تھیں، پھول لُٹانے لگیں۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے ڈارلنگ!"

سیٹھ صاحب شوفر کی طرف مڑے اور اُس کے کان پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولے ـــــ

"دیکھ بے! اب ایسی غلطی برداشت نہیں کروں گا۔ جا کر گاڑی لگا۔"

وہ اپنے کان سہلاتا ہوا چلا گیا۔ سیٹھ صاحب وہیں کھڑے ہوئے لڑکی سے راز و نیاز میں مصروف ہو گئے۔

چند منٹ بعد اُودے رنگ کی بیوک بے آواز رینگتی ہوئی پورٹیکو پر آ کر ہچکولے کے ساتھ ٹھہر گئی۔ شوفر نے اُتر کر کھڑکی کھولی اور یہ بے ہنگم بے جوڑ جوڑا اُس کی پچھلی نشستوں میں دھنس گیا اور شوفر فرنٹ سیٹ پر جم گیا۔

"مال روڈ ہوتے ہوئے بلیو ڈیو ہوٹل ـــــ" سیٹھ صاحب نے حکم صادر فرمایا

کار پھسلنے لگی اور وہ لڑکی سیٹھ صاحب کی خوشامد کرنے لگی۔

"ہنی! میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے چوراہے پر اُتار دینا ـــــ"

"ڈارلنگ! تم تو بالکل بچوں کی سی ضد کرتی ہو ـــــ" سیٹھ نے اُسے پھسلانا چاہا۔ "آج بلیو ڈیو میں اسپیشل آئٹمس ہوں گے ـــــ"

لیکن لڑکی بُری طرح مچل گئی۔ اُس نے اُن کے پیر پکڑ لئے ـــــ

"نہیں پیارے۔ مجھے جانے دو۔ بہت ضروری کام ہے۔"

"میں بھی تو سنوں ـــــ؟"

لڑکی نے آنکھیں جھکا لیں۔

"تم نے بتایا نہیں ـــــ" نہیم سیٹھ نے اصرار کیا۔

شوفر نے سائیڈ مرر میں جھانکا۔ اُس وقت لڑکی پر بے پناہ تقدس کا ہالہ جھلملا رہا تھا۔ اُس کی نیلی نیلی گہری آنکھوں کی تہہ میں بیکراں درد جھلک رہا تھا۔

اور پھر اس نے لڑکی کو بہت دور سے آتی ہوئی سونے کی گھنٹیوں جیسی مدھری آواز سنی۔

"مجھے ٹیلیگراف آفس جانا ہے منی آرڈر کرنے کے لئے۔ بھائی کو اگر کل روپیہ نہ ملا تو اس کا نام انجینئرنگ کالج سے خارج کر دیا جائے گا۔ یہ اس کا فائنل ایئر ہے۔"

شوفر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہے۔ اسٹیئرنگ۔۔ اس کے ہاتھوں میں ڈگمگانے لگا اور اس نے لگاتار ہارن بجانا شروع کر دیئے۔

پوں ——— پوں ——— پیں ——— پیں

لیکن سیٹھ کی آنکھیں اسی طرح چمک رہی تھیں اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی اور پھر یک ایک خوشگوار ہچکولے کے ساتھ رک گئی۔ شوفر نے چونک کر دیکھا نہ جانے کس دھن میں وہ کار کو ٹیلیگراف آفس لے آیا تھا۔

"بس —!" اسے پچھلی سیٹ سے سیٹھ فہیم کی آواز سنائی دی۔

"عرفانہ بیبی اندر ——— بھائی کو صرف تین سو درکار ہوں گے۔"

"میرے پاس چھوٹے نوٹ نہیں ہیں۔ خیر سو کا ہی لیجاؤ ——"

لڑکی اتر کر جا رہی تھی۔ شوفر نے کنکھیوں سے دیکھا چند نیلے نیلے نوٹ اس کے ہاتھوں میں پھڑپھڑا رہے تھے۔

اور پھر وہ چلی گئی۔

شوفر کو یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی اس کی اپنی موت اتر گئی ہو۔ پھر اچانک چونک کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گیئر بدل کر ریس کرنے لگا۔

"ارے ادھر کہاں موڑ رہا ہے سالے!" سیٹھ غرائے۔

"حضور! بلیو ویل ہوٹل نہ جائیے گا کیا؟" اس نے گھگھیا کر کہا۔

"گدھے! اب وہاں کیا رکھا ہے۔ تجھے یہاں آنے کو کس نے کہا تھا۔؟"

شوفر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے یوں ہی مشین پہ جھکا رہا۔

"ڈرائیور ——— "للّی جیولرز" چلو ———"

کار پھر فراٹے بھرنے لگی۔

عالیشان عمارتوں، چوراہوں، ٹھیلے کھینچتے ہوئے مزدوروں اور رینگتے ہوئے ہجوم کے درمیان سے شاہانہ تمکنت کے ساتھ گزرتی ہوئی بیوک للّی جیولرز کے پورٹیکو میں پہنچ کر رک گئی۔ سیٹھ صاحب اپنی تمامتر رعونت ساتھ میں لئے کار سے باہر آئے اور اکڑتے ہوئے دکان میں داخل ہو گئے۔ جواہرات اور جڑاؤ زیوروں کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھی۔ چاروں طرف قارون کا خزانہ سا بکھرا ہوا تھا۔ سیٹھ نعیم شو ہال میں شہر کے ایک دوسرے رئیس جگی لال کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکے وہ ہاروں کے چار پانچ نیکلیس لئے ہوئے تھا۔

" جے ہند مسٹر جگی لال ———!"

" او نعیم بھائی! آداب عرض ہے۔ کہئے کیسے؟" جگی لعل اخلاق مجسم بن گیا۔

" کچھ نہیں، سوچا کوئی نئی چیز آئی ہو تو بیگم کے لئے لیتا جاؤں۔"

اسی وقت منیجر آ گیا۔ لیکن سیٹھ نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی۔ سیٹھ جگی لعل نے کہا ———

" جی ہاں کئی اچھی چیزیں آئی ہیں۔ نیلم کی انگوٹھیاں، ہیرے کی چوڑیاں، جڑاؤ نیکلیس اور ہیرے کے کنگن ———"

" آپ نے کتنا خریدا؟ "

" صرف پینتالیس ہزار کا ——— باقی شہر بھر میں آگرا ہی آپ کے لئے چھوڑ دی گئی ہیں۔" جگی لعل نے انگلیاں چٹخانے کی حد تک مونچھیں مروڑتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

" خوب ——— آپ نے ذرا نیچی بھی پسند کرنے میں عجلت کی۔" سیٹھ نعیم بولے۔ اور پھر اپنے ہمعصر رئیس پر محض اپنی فضول خرچی کی دھاک بٹھانے کے لئے انہوں نے ٹھیک چھیانوے ہزار کے زیورات خرید ڈالے۔ کیٹلاگ بنا دیا گیا۔ چیک کاٹ کر کیشیئر کو دے دیا گیا۔ اور

جگی لس کو حیران و سراسیمہ پیچھے چھوڑ کر سیٹھ فہیم شاہانہ چال سے چلتے ہوئے جوہری کی دوکان سے باہر نکلے ـــــ

سیڑھیوں پر ایک بڑھیا اپنا تھرتھراتا ہوا ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہوگئی ۔

" سرکار! تین دن سے بھوکی ہوں ـــ"

سرکار کا ہاتھ جیب میں گیا ۔ کھڑکھڑاتے ہوئے سَو کے نوٹ ہی ہاتھ میں آگئے ۔ سِکہ ایک بھی نہ تھا ۔ انھوں نے شوفر کو اشارہ کیا اور وہ دوڑ کر آگیا ـــــ

" تمھارے پاس چینج ہے ؟ "

ساڑھے بارہ آنے اُس کی جیب میں ماں کی دوا لانے کے لئے پڑے تھے ۔ اُس نے سب ہتھیلی پر پھیلا کر سیٹھ کے سامنے پیش کئے اور انھوں نے چٹکی سے تین نئے پیسے کا سِکہ اُٹھا کر بھکارن کے ہاتھ پر رکھ دیا اور آگے بڑھ گئے ۔

شوفر نے بھوک سے نڈھال لاغر بڑھیا کو دیکھا تو اُسے اپنی ماں یاد آگئی ۔ اور اُس نے سارے سِکے اُس کی جھولی میں اُنڈیل دیئے اور سوچنے لگا ۔ اصل بھکاری کون ہے ؟ وہ جو ہزاروں کے زیورات کا پیکٹ بغل میں دبائے سیکڑوں نوٹ جیب میں ڈالے بیوک میں بیٹھنے جا رہا ہے یا یہ بڑھیا جو اُس کے دیئے ہوئے چند پیسوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے ؟

اور اُسی وقت اُسے سیٹھ فہیم کی غراہٹ سنائی دی اور وہ اپنے خیالات کو دماغ میں واپس ٹھونس کر کار کی طرف جھپٹا !

(ستمبر ۱۹۵۸ء)

اوپر کالے کالے ہیبتناک بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان ہے۔ گھنیرے بادل یک لخت گرج پڑتے ہیں بجلی رہ رہ کر کوندتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے فطرت بھی سنگدل ہے اور مجھ پر نامہربان۔ بادلوں کی کڑک اُس کے قہقہے ہیں، اور پیلے کھنکجورے کی طرح لپک جانے والی بجلی اس کی ان قہقہوں کے درمیان کالے کالے ہونٹوں کے بیچ میں سے دکھائی دے جانے والی مکروہ دانتوں کی جھلک ہے۔ اور ایک لمحے کے لئے آنکھوں کو چوندھیا دینے والی اس تابانی کے بعد ماحول پر اندھیرے کی ایک اور تہہ چڑھ جاتی ہے۔ تاریکی اور دبیز سی ہو جاتی ہے۔ پھر وہی اندھیرا۔

اندھیرا۔ اندھیرا۔ اندھیرا
چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا

بجلی پھر کوندی ——

اوہ یہ میرے ذہن میں بھی بجلیاں سی کیوں کوندنے لگیں؟ اف یہ تو پیلے پیلے

جاتے ہیں۔ غلیظ اور بدبودار مکروہ دانت!

گھپ!

پھر وہی سیاہ پردے ذہن پر سرک آئے۔

جیسے سوکینڈل پاور کا بلب غلطی سے جلا کر فوراً ہی بجھا دیا گیا ہو۔

ارے! یہ ان سیاہ پردوں کو سرکاتی ہوئی کون سی کالی بلا میرے وجود پر چڑھی چلی آتی ہے! ——— یہ تو دولت رام ہے!

تو وہ بھی قہقہے لگانے لگا۔ سیاہ گوشت کے لوتھڑوں کی طرح موٹے موٹے کالے کالے ہونٹوں کے بیچ میں سے ہو کر مکروہ دانت کسی خونخوار بھیڑیے کی مانند باہر نکل آئے۔

بجلیاں پھر کوندنے لگیں ——— آہ ——— ! آہ ——— !

انہیں قہقہوں کی گرج اور دانتوں کی لپک نے میرے فرضِ حیات کے ایک ایک دانے کو بھسم کر ڈالا۔

شکھ ——— چین ——— سکون ——— سبھی کچھ تو جھلس دیا ———

پھر وہی بجلی! ———

بند کر یہ قہقہے۔ بھاگ جاؤ سالے یہاں سے! یہ میرا ذہن ہے تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے ——— میں کہتا ہوں جاؤ ——— اب میرے پاس اور رہ ہی کیا گیا ہے۔ جسے مجھ سے چھین کر تم اپنی ذہنی مجبوری کو اب اور زیادہ ذہنی بنانا چاہتے ہو! پتاجی کو میری تعلیم پر صرف کرنے کے لئے جو روپیہ تم نے چوگنی شرح سود پر لیا تھا۔ اس کی پائی پائی تو تم ہماری آبائی جائیداد اور مکان بیچ کر وصول کر چکے ہو۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟

کیا کہا — !

میری چھوٹی بہن ساوتری کا سے بیاہ کرنا — !

ہاہا —

موٹے سیٹھ ! "وہ تو مسلسل فاقہ کشی سے تنگ آ کر اس تانگے والے کے ساتھ چلی گئی جو ہمارے پڑوس میں رہتا تھا۔"

ہاں۔ تم ٹھیک ہی کہتے ہو — اگر میں اس وقت اس کا بیاہ تمہارے ساتھ کرنے پر رضامند ہو گیا ہوتا تو جائیداد نیلام پر نہ چڑھتی — نوکری کی تلاش میں مجھے شہر نہ آنا پڑتا۔ یہ ساوتری یوں تانگے والے کے ساتھ نہ بھاگ جاتی اور پھر آج اس مہیب سناٹے اور ہولناک تاریک رات میں خودکشی کرنے کے ارادے سے میں اس پل پر نہ دکھائی دیتا۔

یہ تو سب ٹھیک ہے سیٹھ صاحب ؟

لیکن یہ سب باتیں تو اسی وقت ممکن تھیں جب میں ساوتری کا بیاہ تمہارے ساتھ کر دیتا —

تمہارے ساتھ ! جس سے میں نفرت کرتا ہوں —

کان کھول کر سن لو — میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں اگر اس حالت میں بھی ساوتری میرے گھر میں ہوتی اور اس ... بیش قیمت پیش کش تم میرے سامنے رکھتے — تب بھی میں تمہیں ٹھکرا دیتا۔

بہتے کیا ہو — ؟

وہ ذلیل تانگے والا تم سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ ساوتری اسے پسند کرتی ہوگی تبھی تو اس کے ساتھ چلی گئی۔ تمہارے نام پر تو اسے قے آتی تھی۔

تم پھر ہنسے — بند کرو اپنی یہ منحوس ہنسی — بھاگ جاؤ یہاں سے

تم نہیں جاؤ گے !

ابھی ــــــ ؟

اچھا تو لو! میں بال پکڑ کر تمھارا سر اس پشتے سے ٹکرائے دیتا ہوں۔ لو۔
ایک بار اور ــــــ

کیوں ٹھیک ہو گئے ، دماغ ؟ آ گئے راستے پر !

اب کیوں بھاگ گئے ! ؟

"اف" ــــــ !

اتنی زوردار گرج اور نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی چمک !

اب تو کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہے اور یہ نمکین سی کیا چیز سر سے رس، رس کر ہونٹوں تک آ رہی ہے ۔ آہ ـــ ارے ــــــ یہ تو خون ہے ؟

یہ کیسے نکل آیا ــــ ؟

اوہ ــــــ شاید میں نے اپنا ہی سر پشتے سے ٹکرا لیا۔

ہاں بس ــــــ یوں ٹھیک ہے ۔
پشتے سے اس طرح سر کو ٹیک لینے سے کتنا آرام ملتا ہے ؟

فضا کتنی تاریک ہے ۔

جیسے ماحول پر گاڑھا گاڑھا سیاہ کاجل لیپ دیا گیا ہو ــــــ زمین سے آسمان تک ۔

دُور دُور تک ــــ تا حدِ نگاہ روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آئی ۔
اُمید کے سارے دیئے گل ہو چکے ہیں ۔
بالکل میری قسمت کی طرح سارے جہان پر تاریکی کا غلاف چڑھا ہوا ہے ۔

بھٹک !

ذہن یک لخت بقعۂ نور کیسے بن گیا ! یہ بجلی کے قمقمے کس نے روشن کر دیئے ! ؟
اب دماغ دمک رہا ہے اور باہر فضا میں تاریکی ہی تاریکی ہے۔ پیروں کے نیچے پُل کا ٹھنڈا
اور پتھریلا فرش ہے اور پُل کے نیچے تیزی کے ساتھ بہنے والی ندی سے گھڑگھڑاہٹ کا شور
بلند ہو ہو کر کانوں سے ٹکرا رہا ہے۔

نہیں ——— !

نہیں ——— نہیں !

یہ گھڑگھڑاہٹ تو رائے بہادر دھنی رام کی مل میں چلنے والی مشینوں کی ہے۔

اُف یہ کیا ہو رہا ہے ؟ ذہن کے پردوں کو چیرتا ہوا کون بڑھتا آ رہا ہے ؟

کھٹ پٹ ——— کھٹ پٹ

گھرڑ ——— گھرڑ ——— گھرڑ

وہی بے ہنگم رفتار ——— گردن میں ویسا ہی خم ——— تیوریوں پر ہو بہو ویسے ہی بل
چال میں وہی تمکنت ہے بھگوان ! یہ تو رائے بہادر دھنی رام کی مل کا جنرل منیجر ہے !

دیکھو منیجر !

میں آخری بار تم سے کہتا ہوں یہ ذلیل اور گھناؤنی حرکت مجھ سے نہیں ہو سکے گی۔

یہ تو سراسر مزدوروں اور مظلوموں، کلرکوں کا خون چوسنا ہے !

نہیں ——— میں ایسا مکروہ اقدام کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہرگز نہیں !

لگاتار چار سالوں سے تم مزدوروں سے زیادہ وقت تک کام لیتے چلے آئے ہو۔ اور
اب جو مزدوروں کے مطالبے سے مجبور ہو کر گورنمنٹ نے معاملے کی تحقیقات کے لئے کمیشن مقرر
کیا ہے تو تم اُسے بھی غلط راستے پر ڈالنا چاہتے ہو ——— بہکانے کی کوشش کرتے ہو۔

میں اس کام میں تمہارا ہاتھ نہیں بٹاؤں گا۔ ان پانچ ہزار روپیوں کی لالچ

دس ہزار مزدوروں کا گلا نہیں گھونٹوں گا۔ اُن کی حق تلفی نہیں کروں گا۔

نہیں ـــــ نہیں

یہ ہرگز نہ ہوگا مجھ سے۔ میں نہ ٹائم ریکارڈ میں تبدیلی کروں گا۔ نہ کمیشن کے سامنے اپنا بیان بدلوں گا۔ مجھے ہر حالت میں سچ کہنا ہے۔

واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے!

میں نے اپنے ہاتھ سے ریکارڈ میں تبدیلی ہرگز نہیں ہونے دیا۔ بیان نہ بدلا خاموشی اختیار کی۔ یہ بھی سراسر غداری ہوگی انسانیت سے۔

ناممکن!

تم میری زبان کو سچ بولنے سے باز نہیں رکھ سکتے کہ میرے بیان پر ہزاروں مزدوروں کی پُر امید نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ میں اُن کی اُمیدوں پر پانی نہیں پھیروں گا۔

تم ناجائز پانچ ہزار روپے دے کر ہزاروں مزدوروں کے لاکھوں کے جائز مطالبات سے سبکدوش ہونا چاہتے ہو...... ہاں ہاں۔ ضرورت تو مجھے آج بھی ہے ان روپیوں کی ـــــ ساوتری اب بھی کنواری ہے۔ سچ کہتے ہو ـــــ میں دیہات سے یہاں آکر بھوکوں مر رہا تھا۔ میں نے ملازمت کے لئے تمہارے سامنے ہاتھ پیر جوڑے تھے یہ سب سچ ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس احسان کے بدلے میں میں اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دوں۔

اور احسان کس بات کا؟ کیا میں نے ان پچاسی روپیوں کے بدلے جو تم ہر ماہ مجھے دیتے ہو، اپنا خون پسینہ نہیں ایک کیا۔

ہاں ـــــ مجھے دوبارہ اسی طرح دربدر پھرنا گوارا ہے۔ لیکن تمہارے ان روپیوں پر تھوکنا بھی پسند نہیں! کیوں جان کھاتے ہو ذلیل آدمی، اٹھاؤ اپنے

کاغذ کے چیتھڑے ـــــ اب میں انھیں کیا کروں گا! سادہ تری کا جہیز۔
آہاہا ـــ کیا تمھیں معلوم نہیں! ایک تانگے والے نے اسے جہیز کے بغیر ہی قبول
کرلیا۔ ــــــــــ

اور! تمھارے لبوں پہ یہ طنزیہ مسکراہٹ کیوں رقص کرنے لگی۔
لو ـــ تم تو ہنسنے بھی لگے۔ کیا سمجھتے ہو اسی طرح میں تمھارے ان نوٹوں
قبول کروں گا۔ تمہارے قدموں پہ اپنا سر جھکا لوں گا ـــــ اٹھاؤ یہ نوٹ اسے
ہٹاؤ ـــــ

نہیں تو لو ـــــ میں خود ہی انھیں پھینکے دیتی ہوں ـــ ایک
ادھر تو اپنی پانچویں گڈی بھی!
ہونھ ـــ پانچ ہزار میں میرا ایمان خریدنے چلا تھا کمبخت!
اُف ـــ آنکھیں تلملانے لگیں ـــ بجلی اتنے زور سے چمک رہی ہے
اور یہ کیا ـــ" یہ کاغذ کے ٹکڑے کیسے اُڑے جارہے ہیں۔ ! لو وہ ندی
میں جا پڑے۔
اور میرے سرٹیفکیٹ اور میرے کہاں گئے ـــ ! خیر جانے دو.... بیکار ہی
تو تھے ـــ ہر جگہ انھیں اعمال نامے کی طرح دکھاتے پھرنے کے بعد بھی مجھے کون سی نوکری مل
گئی تھی۔ ہونھ :-

آہ ! ــــــــــ
ہچکیوں پہ ہچکیاں آرہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آنتیں اُلٹ کر باہر آجائیں گی۔ پیٹ
میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں۔ حلق میں کانٹے سے پڑگئے ہیں۔ خیر لعاب ہی نگل لوں کہ کچھ
تسکین ملے۔
بھگوان ـــــ یہ کیسی تاریکی ہے ـــــ تیرے سنسار میں کتنا اندھیرا ہو رہا ہے۔

آخر اس کا انجام کیا ہونا ہے ؟

کیا اِسی طرح ظلمت کے پردے پڑے رہیں گے دُنیا پر ؟ اندھیرا اسی طرح روشنی پر غالب آتا رہے گا ؟ اس کی کوئی نورانی مشعل روشن نہ ہو گی ؟ مساوات کی کوئی حسین کرن اس گھور اندھکار کو چیر کر نہیں پھوٹے گی کیا ؟ کیا کوئی سکندر اس بحرِ ظلمات کو پار کر کے چشمۂ حیوان تک نہیں پہنچے گا ------- ! بھگوان !

پھر وہی کوندا لپکا ——

ارے ! اب تو ہر چہار سو بجلیاں چمک رہی ہیں ۔ آسمان پر ایک آگ سی لگی ہوئی ہے ہر طرف شعلے اُٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ شعلے اور لپٹیں !

بالکل ویسی ہی چمک ہے انہیں —— جیسے امیر خاں کی آنکھوں میں تھی ۔ سُرخ سُرخ چنگاریاں برساتی ہوئی آنکھیں !

آہ خانصاحب ! تم آ ہی گئے ——

لیکن بہت بے وقت آئے تم ۔ اب تو پنڈلیوں اور رانوں میں اتنی سکت ہی نہیں رہ گئی کہ تمھاری گیریج کے تیل سے بے نیاز اور چھکڑا نما رکشاؤں کو کھینچ سکوں !

کیا کہا تم مجھ سے رکشا نہیں کھچوانا چاہتے ۔

تو پھر کس لئے تکلیف کی ——

کیا وہ دن بھول گئے ؟ جب میں گڑگڑا کر تمہارے پیروں پر گر کر کہہ رہا تھا ۔ مجھ پر اتنا سخت جرمانہ نہ کرو ۔ تمام دن کی مزدوری میں سے کچھ تو مجھے دیدو کہ میرا بیمار بچہ دودھ پینے کے لئے تڑپ کر جان دینے سے بچ جائے ۔

لیکن خانصاحب ! تمہیں تو بادا آدم کے زمانے سے چلتے آئے نئے رکشا کے فریم کی مرمت کے لئے میری مزدوری کے پیسے کاٹنے تھے جو ایک موٹے سیٹھ کے بیٹھ جانے کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا اور ہزاروں منّتوں کے باوجود تم نے جرمانہ وصول کر ہی لیا تھا ۔

آہ ۔ اب زخموں پر کیوں نمک چھڑکتے ہو امیر خاں !

میرا اکلوتا بیٹا تو اُسی دن بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تھا ۔

بھاگ جاؤ یہاں سے ۔ میری آنکھوں میں خون اُترا چلا آتا ہے ۔

اپنی کالی شکل کو ہٹاؤ میری نظروں کے سامنے سے ۔ ورنہ ٹھوکریں مار مار کر نکال دوں گا

نہیں مانو گے تم ؟ تو پھر لو ۔ ایک ۔ اور یہ دوسری ——— اور یہ

تیسری ٹھوکر !

اب دفعان ہو گئے نا !

لاتوں کے بھوت باتوں سے مانتے ہیں کبھی ۔

ہائے !

درد کی ایک تیکھی ٹیس پنجوں سے اُٹھ کر رگوں میں نشتر کیوں چبھو رہی ہے ۔

میں نے پتھر کو ٹھوکریں جو لگائی ہیں ۔

سر سے اب تک خون رِس رہا ہے ۔

سرٹیفکٹ بھی گئے ۔

اونھ ——— ہٹاؤ ۔

ہاں اب مجھے جلدی کرنی چاہیئے کہیں گشت کرتا ہوا کوئی سپاہی اس طرف آنکلا تو میں خود کشی بھی نہ کر سکوں گا ۔ اب اس دُنیا میں رہ کر کروں گا بھی کیا ، یہ تاریکیاں تو اسی طرح مسلط رہیں گی ۔ دولت رام ، امیر خاں اور دھنی رام وغیرہ اس طرح مجھ جیسے کروڑوں بے بس انسانوں کے خون سے ہولیاں کھیلتے رہیں گے ۔ ہمارا گرم گرم خون ان کی تجوریوں کو وزنی بناتا رہے گا ۔ کارخانوں کو چلاتا رہے گا ۔ رکشوں پہ اُن کی انسانیت کے جنازوں کو ڈھوتا رہے گا

بس یہی آخری راستہ ہے ۔ خود کشی میں نجات ہے ؟

دریا کی طرف تو دیکھے سے ہول آتا ہے!

ہاں یوں ٹھیک ہے۔

اس پشتے پر چڑھ جاؤ۔

اب آنکھیں بند کر لو۔

بس۔ بس

اب صرف ایک چھلانگ کی دیر ہے۔

شاباش!

ہمت کرو۔

ابدی سکون تمھارا منتظر ہے!

اوہ — یہ سرخ سرخ سی نورانی کرنیں کیسی پھوٹ رہی ہیں۔ کہیں میرے اندر سے!

ان سے تمام ذہن منور ہو گیا۔

یہ کونے میں دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے میری ماں بیٹھی ہے۔

کیسی پُر امید ہیں اس کی نگاہیں!

وہ دروازے سے ٹیک لگائے، آشاؤں کے دیپ نگاہوں میں جلائے میری بیوی کھڑی ہے۔

اور یہ — یہ شہزادیوں کا سا لباس پہنے سات گھوڑوں کے رتھ پر سوار حسین و صحتمند نوجوان کے ساتھ ساوتری بھی آنکلی۔

نہیں —

میں خودکشی نہیں کروں گا۔ یہ تو پاگل پن ہے۔ بزدلی ہے۔ زندگی سے فرار

ابھی ہزاروں ماؤں، بیویوں اور ساوتریوں کو میری ضرورت ہے۔

دور کیوں نہ ہوگی یہ تاریکی ——— !
ہم ہی اسے اُجالے میں بدلیں گے۔ اپنا خون دے کر امیدوں کی جوتیں جگائیں گے۔

اب مجھے گھر چلنا چاہیئے۔ ماتا جی اور مُنّا کی ماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔
کھول دو آنکھیں۔ چلو اُترے پُشتے سے !

ارے !
اب تو اندھیرا چھٹ چلا ہے۔ مشرق کی طرف اُفق پر روشنی نمودار ہو رہی ہے اور کالے کالے بادلوں کے بیچ سے وہ ایک ننھا مُنّا ستارا میری طرف جھانک کر مسکرا رہا ہے !

(فروری ۱۹۵۵ء)

خدا اور انسان

Best

شب قدر کی پاکیزہ رات تھی

دربار الٰہی میں نذرانے پیش ہو رہے تھے ایک مقدس فرشتہ، جس نے سپید بادلوں کی عبا پہن رکھی تھی۔ کرسیٔ قدس کے سامنے رکوع میں جا کر نور کا طباق سامنے رکھتا ہوا بولا۔

خداوند قدوس کی درگاہ میں مولانا ادریس ہندی کا تحفہ ـــ"

"کیا نذرانہ بھیجا ہے ہمارے اس نادان بندے نے؟" کرسی سے بادلوں کے گرجنے کی سی آواز پیدا ہوئی۔ جس میں صد ہا نقرئی گھنٹوں کے بجنے کی سی صدا بھی شامل تھی۔

فرشتہ سجدے میں گر گیا ـــ

پروردگار! مولانا ادریس تو عبادت و پاکیزگی میں ہم فرشتوں سے بھی اوپر اٹھتا جا رہا ہے اِس سال اس نے بارگاہ ایزدی میں ستره ہزار نمازیں، چھ ماہ کے روزے، ایک حج اور ڈیڑھ سو شب بیداریاں ارسال کی ہیں ـــ"

"ہوں ـــ" کرسی سے ایک طنزیہ آواز بلند ہوئی ـــ" ان سب کو اٹھا کر فضولیات کی کوٹھری میں پھینک دو ـــ"

"خداوندا!" فرشتے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ـــ کیا مولانا ادریس ہندی

کے زہد و اتقا کا یہی انجام ہے!"

"حکم کی تعمیل ہو ــــــ" روکھی آواز میں جواب ملا۔ فرشتہ لرز گیا اور ایک ساتھ کئی سجدے ادا کرکے طباقِ نور لئے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ فضولیات کی کوٹھری کی طرف چلا گیا۔

وہی فرشتہ اپنے مقدس بار سے سبکدوش ہو کر واپس [illegible] تھا کہ شہد اور دودھ کی نہروں کے سنگم پر اُسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نظر آگئے ــ

"کیوں میاں فرشتے! تم اتنے ملول و دل گرفتہ کیوں نظر آتے ہو؟" انھوں نے پوچھا ــــ "یا حضرت! کیا عرض کروں ــــ" فرشتہ بہت ادب سے بولا ــــ" اب انسان کی طرح خدا کے دربار میں بھی جھوٹی شکایتوں کا اثر ہونے لگا ہے۔"

"کیا مطلب ــــ؟" حضرت موسیٰؑ نے چونک کر دریافت فرمایا۔

فرشتے نے وضاحت پیش کی ــــ

اے خدا کے مقدس پیغمبر! میں خدا کے نیک بندے مولانا ادریس ہندی کے نیک اعمال کا محاسب ہوں۔ دن اور رات کا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جب میں اس کے شانے پر موجود رہ کر اُس کے ہر عمل کا مشاہدہ نہ کرتا ہوں۔ اُس پاکیزہ خصلت انسان کا یہ عالم ہے۔ کہ سانس بھی لیتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ لیکن آج جب میں اس کی سال بھر کی نمازیں، روزے، شب بیداریاں اور حج اکٹھا کر کے خداوندِ پاک کی درگاہ میں نذر کرنے لے گیا تو وہاں سے حکم جاری ہوا کہ انھیں فضولیات کی کوٹھری میں پھینک دوں!"

"واقعی ــ یہ تو حیرت کی بات ہے ــ" حضرت موسیٰؑ نے فرمایا ــــ "لیکن اس کا کوئی سبب بھی تو ہوگا؟"

یا حضرت! میرے خیال میں تو یہ سب اُس فرشتے کی حرکتیں ہیں جو مولانا ادریس ہندی

کے بُرے اعمال کا حساب رکھنے پر مامور ہے؟

"میں سمجھا نہیں ـــــــ" موسیٰؑ بولے۔

"شاید اسی نے مولانائے محترم کے متعلق جھوٹی رپورٹیں دربار ایزدی میں کی ہیں آؤ دیکھیں۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے ـــ"

حضرت موسیٰؑ اس فرشتے کے ہمراہ ایک بہت بڑے آسمانی دفتر میں گئے جہاں اربوں فرشتے اپنے سامنے ہمالیہ سے بھی صدگنا بلند، کاغذات کے ڈھیر لگائے حساب کتاب میں مصروف تھے۔ وہ فرشتہ جو اس دفتر کا انچارج تھا، حضرت موسیٰؑ کو دیکھ کر بھاگا ہوا آیا اور ادب سے سر جھکا کر سلام کرتا ہوا بولا ـــــ

"حضور! کیسے تکلیف فرمائی!"

"بھئی! مجھے ذرا مولانا ادریس ہندی کا اعمالنامہ دیکھنا ہے ـــ"

ایک لمحے کے اندر اندر مطلوبہ اعمالنامہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے پیش کر دیا گیا اور کلیم اللہ کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ مولانا ادریس ہندی کے اعمالنامے میں نیکیوں کا کالم نمازوں، روزوں اور حجوں سے پُر تھا اور بدی کا کالم بالکل کورا پڑا تھا۔ انھوں نے انچارج دفتر سے دریافت کیا ـــ

"کیا حال ہی میں اس شخص کے بُرے اعمال و افعال پر نگرانی رکھنے والے فرشتے نے کوئی رپورٹ پیش کی ہے جس کا اندراج اعمالنامے میں نہ ہوا ہو؟"

"جی نہیں!" انچارج فرشتے نے جواب دیا ـــ "ہمارے دفتر سے وقتاً فوقتاً مختلف فرشتے اس کام پر مامور کیے گئے لیکن کوئی اس انسان کا ایک بھی بُرا فعل نوٹ نہیں کر سکا۔ ابھی کل ہی تو میں اس کی بدیوں کا حساب رکھنے والے فرشتے پر چارج شیٹ بھی بھجوا چکا ہوں۔"

"کس قسم کی چارج شیٹ!"

"یہی کہ وہ اپنا کام محنت سے سرانجام نہیں دیتا ——"

نہیں حضور! "حضرت موسیٰ کا ہمراہی فرشتہ بولا۔ — "میں بھی تو دن رات مولانا ادریس ہندی کے شانوں پر رہتا ہوں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اُن کے بُرے اعمال کا محاسب فرشتہ بہت چاق و چوبند رہتا ہے لیکن جب مولانا سے کوئی بُرا عمل ہی سرزد نہ ہو تو ...."

لیکن ابھی تو تم مجھ سے کہہ رہے تھے —— حضرت موسیٰؑ نے کہا۔" کہ اس فرشتے نے مولانا کی جھوٹی شکایتیں کی ہوں گی ۔"

"یا حضرت!" فرشتے نے سر خم کرتے ہوئے اپنے پر پھڑپھڑائے —— "خدائے پاک کے اس عجیب حکم کو سن کر میں یہی سمجھا تھا ——"

"ہوں —" حضرت موسیٰؑ نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔" تو اب دربارِ ایزدی میں بھی اس قسم کی بدعنوانیاں ہونے لگی ہیں۔ قسم ہے مجھے اُسی خداوند پاک کی، اگر وہ بھی انصاف کی راہ سے ہٹ گیا ہے تو میں آج فرعون کی طرح اس سے بھی ٹکرا جاؤں گا ۔"

حضرت موسیٰؑ کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سُرخ ہو گئیں۔ آسمان پر سناٹا سا چھا گیا۔ موسیٰؑ پیر پٹکتے ہوئے عرش کی طرف چلے۔ فرشتے ایک انسان کی اتنی جرأت دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگے!

عرش کے سامنے پہنچ کر پردے کو سختی سے پکڑتے ہوئے حضرت موسیٰؑ نے کہا

"خداوند! موسیٰ تیری درگاہ میں حاضر ہے۔"

"کیوں کلیم۔ مزاج تو اچھے ہیں؟"

"رحمت ہے تیری ——"

"لیکن آج تمھاری جبیں اتنی پُرشکن کیوں ہے؟ اور آنکھوں میں یہ سُرخی کیسی؟"

ہلکے سے تبسم کے ساتھ دریافت کیا گیا۔

"اے زمین و آسمان اور تمام کائنات کے مالک!" حضرتِ موسیٰ گرج کر بولے۔
تجھے وہ دور بھی یاد ہو گا۔ جب تیرا ہی حقیر بندہ انسانیت پر فرعون کے مظالم دیکھ کر اُس سے
ٹکرایا تھا اور آج تیرا وہی بندہ تیرے ہی قہر و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اگر تیری جانب سے
بھی انسان سے بے انصافی برتی گئی تو ...." موسیٰؑ فرطِ غضب سے کانپنے لگے۔

"ہاں، ہاں —— کہو موسیٰؑ۔ تم رُک کیوں گئے۔؟" پردے سے آواز آئی۔

"خدایا۔! اپنے بندے کو گستاخی پر مجبور نہ کر!"

"ہمیں یہ گستاخیاں بہت پیاری ہیں کلیم! ہم تمہارا یہ ادھورا جملہ پورا سُننے کے مشتاق ہیں۔"

"تو پھر سُن!" حضرت موسیٰؑ نے اپنی تمام تر جرأتوں کے ساتھ کہا —— "کہ
اگر تو بغیر کسی سبب کے مولانا ادریس ہندی جیسے پاکباز بندے کی عبادتوں کو ٹھکراتا ہے گا
تو میں ..... تو میں ...... تجھ سے معافی چاہتے ہوئے کہتا ہوں .... کہ میں تجھ سے
بھی مقابلہ کرنے کی جرأت کر ڈالوں گا۔"

جواب میں پردے کی پُشت سے ایک عجیب سا قہقہہ سُنائی دیا ——

ہم خوش ہوئے کلیم! آج کے انسان میں بھی انسانیت کے لئے ہم ایسا
ہی درد دیکھنا چاہتے ہیں جو تمہارے دل میں ہے۔ ارے میاں جبریلؑ! ذرا ہمارے کلیم
کے سامنے سیتارام کا اعمالنامہ پیش کرو ——"

دوسرے لمحے جناب جبریلؑ ہاتھوں میں ایک شکستہ سا اعمالنامہ لئے ہوئے حضرت
موسیٰؑ کے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

حضرت موسیٰؑ نے جھلا کر اعمالنامہ جبریلؑ کے ہاتھوں سے لے لیا اور جلدی
جلدی صفحات پلٹنے لگے۔ شاید یہ شخص سیتارام اپنی تمام زندگی بھر چوری چکاری، دروغ
حلفی اور دغابازی کرتا رہا تھا۔

"میں اس شخص کا انجام جاننا چاہتا ہوں خداوندا!" موسیٰؑ بولے
"ہم نے آج اُسے فردوس بریں کے ایک حسین خطّے میں پہنچا دیا ہے!"
فرطِ حیرت سے اعمالنامہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔
"یہ کیسا اندھیر ہے ربِّ سمٰوات! کیا بدلتی ہوئی دُنیا کے ساتھ تیرے اصول بھی بدلتے جا رہے ہیں؟"
"نہیں کلیم! نیک قدریں ہر زمانے میں نیک ہی ہوتی ہیں۔"
"تو پھر یہ سب کیا ہے؟ مولانا ادریس ہندی کی پُر خلوص عبادتیں تو فضولیات کی کوٹھری میں پھنکوا دی جاتی ہیں اور سیتا رام جیسے گناہگار بندے جنّت میں موج اڑاتے ہیں!"
"ہاں میرے انجان کلیم!" پردے کے پیچھے سے آواز آئی ـــــــ انصاف کا تقاضہ یہی ہے۔ ورنہ پھر میری عدالت اور دُنیاوی عدالتوں میں کوئی فرق ہی نہ رہے دُنیاوی عدالتوں نے سیتا رام کو جیل میں تو بھیجا لیکن یہ نہ دیکھا کہ اُس نے چوریاں اس لئے کی تھیں کہ اُس کے اور اس کے مرحوم بھائی کے بچّے بھی بھوک محسوس کرتے تھے۔ دنیاوی عدالت نے آج اُسے جرمِ قتل میں پھانسی پر تو چڑھا دیا لیکن یہ نہ دیکھا کہ اُس نے جاگیردار کو محض اس لئے قتل کیا تھا کہ وہ سیکڑوں کنواری لڑکیوں کی عصمتیں خاک میں ملا چکا تھا ـــ اچھا کلیم، تم ہی بتاؤ فرعون کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچانے کے جُرم میں تمہیں کون سی سزا دی گئی تھی!"
"بس خداوندا بس!" موسیٰؑ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخے ـــ "مجھے سیتا رام کے جنّت میں بھیجے جانے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن وہ مولانا ادریس ہندی........"
"ہاں کلیم! میں نے اُس کی تمام عبادتیں، اُس کی تمام نمازیں اور شب بیداریاں اس کے مُنہ پر مار دی ہیں ـــ کیوں ـــ جاننا چاہتے ہو ـــ تو سُنو ـــ ادریس خود تو

پاکباز ہے لیکن اُس کی وجہ سے اس کے لواحقین گناہ گار گردانے جاتے ہیں ۔"

"میں سمجھا نہیں میرے پروردگار ۔۔" موسیٰؑ نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

"ابھی سمجھ جاؤ گے ۔" پردے سے ندا آئی ۔" فرشتے جو ہر انسان کی نیکی اور بدی کا حساب رکھنے پر مامور ہیں، اُس انسان کے اعمال کا محاسبہ تو کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اس گناہ کا اصل محرک کون ہے اور بعض اوقات خلوصِ دل سے کیا ہوا گناہ کبیرہ بھی خلوص سے معرا نیکی سے بدرجہا مقدس ہوا کرتا ہے کلیم ! کیا تم سمجھتے ہو کہ عبادت میری خوراک ہے ۔ اگر مجھے عبادت ہی پسند ہوتی تو دن رات اپنی عبادت کرنے والے فرشتوں کو عصیاں کے مجسمے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم نہ دیتا ۔"

"خداوندا ! میں پھر بھی نہیں سمجھا ۔" موسیٰؑ بولے ۔

"تم یہی جاننا چاہتے ہو نا ! کہ میں نے مولانا اویس ہندی کی عبادتیں قبول کیوں نہیں کیں ۔ اچھا تو آنکھیں بند کر کے دیکھو ۔۔ یہ جو حجرے میں آنکھیں بند کئے ہوئے تسبیح پڑھ رہا ہے، یہی ہے تمہارا اویس ہندی ۔ یہ میری یاد میں دُنیا سے بیگانہ ہو چکا ہے ۔ اور یہ جو تمہیں رونے کی آواز سُنائی دے رہی ہے یہ اُس کے پڑوسی کا بھوکا بچّہ ہے جس کا باپ مجبور ہو کر غلط طریقوں پر روپیہ کمانے کے لئے گھر سے نکلا ہے اور وہ عورت جو غیر مرد کے ساتھ مصروفِ اختلاط ہے اسی مولانا اویس ہندی کی بیوی ہے ۔ بُرے اعمال کا حساب رکھنے والے فرشتوں کے ہاتھ دیکھو کس تیزی کے ساتھ اُس بچے کے باپ، مولانا کی بیوی اور اُس کے ساتھ دادِ عیش دینے والے مرد کے اعمال ناموں پر چل رہے ہیں ۔ فرشتے ایک انسان کے ساتھ دوسرے انسان کے مربوط و بسوط تعلقات کو کیا جانیں ۔ لیکن میں تو سب کچھ دیکھتا ہوں ۔ کیا تم اب بھی نہیں سمجھ پائے کہ اس مولانا اویس ہندی کے آس پاس ہونے والے تمام گناہ دراصل اس کے اپنے گناہ ہیں ۔ اس کا سب سے بڑا گناہ تو یہی ہے کلیم ! کہ اُس نے خدا کی تلاش میں انسان کو گم کر دیا ہے !"

"میں سمجھ گیا خداوندا ۔ میں سمجھ گیا ۔ مجھے معاف فرما دے میرے پروردگار !"

اور موسیٰؑ سجدے میں گر گئے ۔

(اکتوبر ۵۶ء)

رات کا گاہک

مول گنج کی اس عالیشان عمارت کی تیسری منزل کے آرام دہ کمرے میں قیمتی سنہری پردبیز گدے اور سرخاب کے پروں والے ملائم تکیئے پر پڑی کملا بُری طرح بور ہو رہی تھی
آج صبح ہی سے اس کی طبیعت مضمحل تھی۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ سر پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ ٹھہر ٹھہر کر عضو عضو میں یک لخت کچھ اس طرح کی ٹیسیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ جیسے کسی نے رگ رگ میں ہزاروں نشتر پیوست کر دیئے ہوں۔

یوں تو اُس کا پیشہ ہی کچھ اس قسم کا تھا جس میں ہر رات کوئی عیاش مرد، روکھا فلسفی، بکھرے والوں کا شاعر، ویران نگاہوں والے خود بے ختہ ادیب، توندیل سیٹھ، بگڑے ہوئے رئیس یا مریل کلرک آتے۔ سڑک پر کھڑے ہو کر نگاہیں اونچی کر کے اُسے بالاخانے کے جھروکے میں بیٹھے ہوئے دیکھتے۔ اُس کی حسین گولائیوں اور تیکھے خموں کا جائزہ لیتے۔ عارضوں کی سُرخی، لبوں کی شیرینی، بازوؤں اور کولھوں کے گداز اور کمر کی تنگی کا اندازہ لگاتے اور جب ہر طرح سے اُنھیں جچتا تو اس کے حسین جسم کا سودا کرنے کے لئے دو زینے طے کر کے اوپر آجاتے اور عام طور پر اُسے اپنے جسم کو ایک شب کے لئے فروخت کر کے مُنہ مانگے دام مل جاتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ دوسرے دن کے لئے اس قسم کی تھکن بھی۔

لیکن گذشتہ شب ایک عجیب ہی قسم کے گاہک سے واسطہ پڑا تھا اُس کا۔ عام طور پر جو خریدار اس کے یہاں آتے تھے وہ اگر باذوق ہوتے تو پہلے اُس سے داغ یا غالب کی ایک آدھ غزل سُنتے اور ساتھ ہی ساتھ اسکاچ وہسکی سے شغل فرماتے، پھر جب سرور میں آتے تو اس سے اپنے والہانہ عشق کا اظہار کرتے رفتہ رفتہ بے تکلف ہو جاتے اور آخر کچھ دیر بعد جب جذبات نفسانی خواہشات کی بھٹی میں تپ کر سُرخ ہو جاتے تو وہ انسانیت اور تہذیب کا لبادہ اُتار کر بالائے طاق رکھ دیتے اور کسی وحشی درندے کا روپ دھارن کر لیتے۔ اُسے مسلتے، نوچتے اور وہ دِل میں آہوں اور سسکیوں کا طوفان اور ہونٹوں پر تبسم نمایاں کئے یہ سب زیادتیاں برداشت کئے جاتی۔ حتّٰی کہ خریدار یا تو تھک ہار کر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے زینوں سے نیچے اُتر جاتا یا پھر شراب کا بڑھتا ہوا نشہ اس کے حواس معطّل کر دیتا۔ اور نشے میں دھت وہیں فرش کے کسی کونے میں اوندھے منہ پڑ جاتا اور وہ اپنی جسمانی کوفت اور روحانی کرب کو دُور کرنے کے لئے بستر پر پڑ جاتی اور دوسرے دِن دوپہر تک پڑی رہتی۔

لیکن کل رات کا گاہک! ——— بڑی عجیب شخصیت کا مالک تھا وہ ——— وہ سرِ شام سے ہی اُسے مول گنج کی سڑکوں پر چکر لگاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اپنے جھروکے میں بیٹھی ہوئی وہ نیچے کھڑے ہوئے منچلوں کو اپنی جانب راغب کرنے اور اُن میں جنسی جذبات کو گُدگُدانے کے لئے اپنے ہزار بار آزمودہ حیا سوز اشاروں اور زہد شکن اداؤں سے کام لے رہی تھی اور اسی دوران میں اُس نے اُسے بہترین سُوٹ میں ملبوس پُر تمکنت چال سے ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ اُس کی ہر ادا سے بے التفاتی مترشح تھی لیکن اپنے دیرینہ تجربے کی بناء پر اُس نے بھانپ ہی لیا تھا کہ وہ ہر بار موڑ گھومتے ہوئے کنکھیوں سے ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ضرور ڈال لیتا تھا اور پھر جب رات کو ساڑھے بارہ بجے وہ اپنے دو مستقل گاہکوں سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ وہ آدھمکا۔

"مجھے اجازت ہے اندر آنے کی؟" اُس نے دروازے پر رُک کر بڑے نپے تُلے

مجھے یں پوچھا تھا جیسے وہ طوائف کا نہیں کسی بیگم کا کمرہ ہو اور وہ سراپا انکسار بنکر معذرت کرنے لگی تھی ـــــ

"حضور! ویسے تو غریب خانہ آپ کا ہے لیکن اگر کل تشریف لاتے تو مجھ پر کرم ہوتا ـــــ"

"مجھے آپ کے حکم کی تعمیل میں کوئی عذر نہ تھا لیکن بدقسمتی سے میں کل ہی اس شہر سے رخصت ہو رہا ہوں ـ"

اور پھر اس جواب کے بعد اس کے لئے نجات کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہ گئی تھی پھر وہ مرد اس کے جسم کو صبح کے چار بجے تک نوچتا اور بھنبھوڑتا رہا۔ اس اثناء میں اس نے تہذیب اور انسانیت کا جامہ دور اتار پھینکا تھا اور سراپا درندہ بن گیا تھا۔ شدتِ جذبات سے اس کے جبڑے بھنچ گئے تھے اور دانت کسی خونخوار بھیڑیے کی طرح ہونٹوں سے باہر نکل آئے تھے۔ کبھی کبھی جوش میں آکر وہ کملا کو اس بُری طرح بھینچ لیتا تھا کہ اس کی ہڈی ہڈی چٹخ اٹھتی تھی اور کملا کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آج رات اس کا ایک ایک جوڑ پلاسٹک کی گڑیا کی طرح الگ الگ ہو جائے گا۔ بارے چار بجے کے قریب اس کو سکون نصیب ہوا اور وہ سو روپے کا نوٹ کملا کے ہاتھ میں تھما کر ڈگمگاتا ہوا چلا گیا۔

اس گاہک کے روانہ ہونے کے بعد ہی کملا کی آنکھ لگ گئی تھی لیکن دو گھنٹوں بعد اس کی نیند اچٹ گئی۔ صبح ہی صبح ملک کے مشہور رہنما شری شو بھت چند کی آمد کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ جیسے ہی کملا کی آنکھ جھپکتی۔ کوئی نیا تانگہ یا ٹیکسی لاؤڈ اسپیکر پہ اعلان کرتی ہوئی گزرتی اور اس کی آنکھ جھٹ سے کھل جاتی اور کچھ اسی قسم کی آوازیں اس کے کانوں میں خراش ڈالنے لگتیں ـــــ

"فخر کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ دیش کے مشہور لیڈر شری شو بھت چند آج دس بجے ملک کے اہم مسائل پر ایک مدلل تقریر فرمائیں گے۔ عوام سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ

پریڈ گراؤنڈ پر جمع ہو کر اُن کے بصیرت افروز خیالات سے مستفید ہوں ——"

اور کملا اپنی جھپکتی ہوئی آنکھوں کو مَل مَل کر جلن دُور کرنے کی کوشش کرتی رہجاتی اور پھر جب اُس پر دوبارہ غنودگی طاری ہوتی پھر اُسی قسم کا کوئی تانگہ یا موٹر ....!

"پبلک کی سہولت کے لئے ہم نے شہر بھر میں جگہ جگہ لاؤڈ اسپیکر لگا رکھے ہیں تاکہ شوبھت چندجی کا بھاشن مردوں کے علاوہ ہماری مائیں اور بہنیں بھی سُن سکیں....."

اور کملا جھنجھلا کر کراہنے لگتی۔ کبھی وہ رات والے اس وحشی گاہک کو دِل ہی دِل میں کوستی اور کبھی بے اختیار ہو کر اس کا جی چاہتا کہ اپنی بوٹی بوٹی نوچ کر پھینک دے جن میں درد اور ٹیسیں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں لیکن غضب اُس وقت ہوا جب دس بجے کملا کی نیند پھر اُچٹ گئی۔ اُس کا سر اس طرح بھاری ہو رہا تھا جیسے برف کا گولا ہو اور لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں اس پر ہتھوڑے سے لگا رہی تھیں۔ شوبھت چند کا بھاشن شروع ہو چکا تھا پہلے تو کملا تقریر سُن سُن کر جھنجھلاتی رہی اور اُسے یوں محسوس ہوتا رہا۔ جیسے تقریر کا ہر جملہ اُس کے درد میں اضافہ کر رہا ہو۔ وہی گھسی پٹی باتیں تقریر میں کہی جا رہی تھیں جو اس سے قبل سبھی لیڈر سیکڑوں بار کہہ چکے تھے۔ ملک کی غریبی۔ بڑھتی ہوئی بیکاری، عوام کی مشکلات گرانی، غلّے کی کمی، اور اسی نوعیت کی دوسری باتوں کا رونا —— لیکن اس کے بعد جب لکچر کا دوسرا دَور شروع ہوا تو کملا کا درد بکلبخت نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ آنکھوں کی جلن دور ہو گئی اور اس کا من اس طرح کھل اُٹھا جیسے وہ تمام رات آرام اور سکون کے ساتھ سو کر اُٹھی ہو۔ لیڈر صاحب اب طوائفوں کی زندگی کا خاکہ بیان فرما رہے تھے۔ انھیں اپنے دیش کی ماؤں اور بہنوں کی یہ تذلیل قطعاً گوارہ نہ تھی۔ وہ اس نظام کے کٹّر دشمن تھے جس نے لاکھوں عورتوں کو عصمت فروشی پر مجبور کر دیا تھا اور جب تقریر میں انھوں نے ایک ایسے نظام حکومت کی تمنا ظاہر کی جس پر عمل کرتے ہوئے ایک قریبی ملک نے اپنے یہاں سے عصمت فروشی اور سیاہ کاری کو دیش نکالا دے دیا تھا تو بے اختیار کملا کا جی چاہا

کہ کاش اس کے پر نکل آئیں اور اُسی وقت اُڑ کر نیتا جی کے پاس پہنچے اور اُن کے چرن پکڑ کر کہے ــــــ

"دیوتا مجھے اس دیش میں پہنچا دو!"

پر تو اس کے نکلے نہیں لہٰذا اس نے جھروکے سے لٹک کر اپنی پڑوسن سے کہا ــــــ

"اری سکینہ! سنتی ہے نیتا کیا کہہ رہے ہیں ــــــ؟"

اور سکینہ نے بھویں چڑھا کر جواب دیا ــــــ

"بکتے ہیں ری! ہماری قسمت میں تو اسی طرح ہر رات مر مر کر جینا لکھا ہے"

نہ جانے کس گوشے سے کملا کے دل میں اتنے پیارے نیتا شوبھت چند کے لیے عقیدت امڈ پڑی اور جب اُن کی تقریر ختم ہوگئی تو کملا کو محسوس ہوا جیسے اب تک وہ کسی اور ہی دُنیا میں تھی اور اب دوبارہ اُس بدنما اور غلیظ دُنیا میں پھینک دی گئی ہے۔ شوبھت چند کی تقریر کے بعد فوراً ابعد ہی کسی دوسرے شخص کی آواز کملا کو لاؤڈ اسپیکر پر سنائی دی۔ اور اُس کا من پھر سے کھل اٹھا۔ اعلان کیا گیا تھا۔ اُس قائدِ اعظم کا جلوس شام کو پانچ بجے شہر کی خاص خاص سڑکوں سے گزرے گا اور پھر پروگرام کی تفصیل بتائے جانے پر کملا کو معلوم ہوا کہ جلوس مول گنج سے ہو کر بھی گذرے گا۔

کملا کا روم روم نلج اٹھا۔ اس طرح وہ اپنے اس دیوتا کے درشن کر سکے گی جو طوائفوں کو بھی عورت، ماں اور بہن سمجھتا ہے۔ اُس نے اُستاد بندو خاں کو مالن کے یہاں سے تازہ گلاب کے بھاری گجرے فوراً لانے کا حکم دیا۔ پھر اندر جا کر غسل کرنے کے بعد ایک سفید ململ کی ساری زیب تن کی، بالکل دیوکنیاؤں کی طرح بیچ سے مانگ نکال کر بالوں کو سنوارا۔ اور بالاخانے پر آبیٹھی۔ آج پہلا دن تھا جب وہ بغیر میک اپ کئے جھروکے پر آئی تھی۔ نہ جانے کیوں آج اس کے ہاتھ بار بار آنچل پر جاتے تھے اور وہ اُسے سنبھال کر سر پر ڈال رہی تھی۔ خدا خدا کر کے پانچ بجنے کو ہوئے۔

دُور سے شور وغل، جے جے کار اور زندہ باد کے نعرے سُنائی دیئے جو بتدریج بلند ہوتے گئے۔ جلوس قریب آگیا تھا۔ کملا نے دیکھا کوئی شخص کھدر کے کُرتے اور پاجامے میں ملبوس پھولوں میں لدا ہوا کھلی ہوئی جیپ میں بیٹھا تھا۔ کملا کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ موٹر اس کے جھروکے کے نیچے آئی تو اس نے بنددھاں کے لائے ہوئے تازہ گلاب کے ہار اُٹھا کر اپنی عقیدت سمیت موٹر پر پھینک دیئے۔

کملا کا دِل زور سے دھڑکا۔ کئی لوگوں نے اُسے دیکھ کر قہقہے بلند کئے۔ پھر نیتا شوکت چند نے بھی نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور دفعتاً کملا کا آنچل سر سے ڈھلک کر شانوں پر آرہا اور اُس کی سونی مانگ کسی اُجاڑ پگڈنڈی کی طرح چمکنے لگی۔ کملا کو اپنے دِل کی حرکت بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی ــــــــ

ہے بھگوان! وہ تو رات والا گاہک تھا!

(مارچ ۱۹۴۷ء)

احسان مند

کافی سہانا منظر تھا جب رامو گونڈ اپنے مویشیوں کا غول لیکر کالے پہاڑ پر پہنچا۔
مینہ کے ہلکے ہلکے جھالے پڑ رہے تھے جن میں خنک ہوا کے جھونکے اِدھر اُدھر
بھٹکتے پھرتے تھے۔ ساگوان، ساج اور تِنسا کے تناور درختوں سے پانی کے قطرے بڑی ہم آہنگی کے
ساتھ پتھریلی زمین پر ٹپک رہے تھے۔ مینڈکوں کی ٹرٹر اور جھینگروں کی ریں ریں نے سماں باندھ
رکھا تھا۔ جن کے درمیان کبھی کبھی غول میں صدائے احتجاج بلند کرتی ہوئی کسی بھینس کے ڈکرانے
کی آواز سنائی دی جاتی۔ کہیں کہیں خودرو پھولوں کی جھاڑیاں کسی تناور درخت کو اس طرح
گھیرے کھڑی دکھائی دیتیں۔ جیسے قدرت نے اپنے ہاتھ سے تیار کر کے بہت بڑا گلدستہ
وہاں پھینک دیا ہو۔ سامنے کی پہاڑی ڈھلان پر سالِ گذشتہ کوئی ٹھیکیدار جنگل کٹوا
چکا تھا۔ پوری پہاڑی پر محکمۂ ٹاکا ڈکا اسٹینڈرڈ (ممنوعہ درخت) اور جھاڑ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔
مخملی گھاس ڈھلان کے آغاز سے لے کر پہاڑی کی چوٹی تک کسی سبز ریشمی قالین کی طرح لہلہا رہی
تھی جس کے دامن میں نیچے کی طرف شفاف برساتی نالے کی چمکیلی روپہلی گوٹ لگی ہوئی تھی
فرطِ مسرت سے رامو گونڈ کا روم روم جھوم رہا تھا۔ اس نے ہنکارا ابھرا۔ مویشی
قدرے تیز چلنے لگے اور پھر لاٹھی کاندھے پر رکھ کر اس نے اپنی پھٹی ہوئی چادر سنبھالی اور

اور گیت کی تان چھیڑ دی۔

"ارے......

تورے من ماں دگا باجی مورے من ملکی نئیں رے

تورے من ماں دگا باجی مورے من ملکی نئیں رے

چوڑ باجو لے دیوں تو پیر بو کے نئیں رے

تورے من ماں دگا باجی مورے من ماں نئیں رے

ارے........"

(تیرے من میں دغابازی ہے میرے من میں نہیں میں چوڑیاں لے دوں تو پہنے گی یا نہیں؟ پہننے کو پہن لوں گی لیکن رہوں گی نہیں۔ تیرے دل میں دغابازی ہے میرے من میں نہیں!)

مویشیوں کی ڈار ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ سالہا سال سے وہ بارش کے موسم میں اس مقام پر آکر دو تین مہینے بغیر کوئی کام کئے ہوئے آرام سے دن بھر چرتے رہتے تھے اور رات کو اس "گوارٹی" میں جگالیاں کیا کرتے جو رامو گونڈ اُن کے لئے پہاڑ کی نسبتاً سپاٹ سطح پر ساگوان اور پتوں کی مدد سے ایک طویل و عریض شامیانے کی شکل میں تیار کرتا تھا۔ کچھ نئی نویلی گائیں جو اس بار پہلی مرتبہ اس گلّے کے ساتھ اس نامانوس مقام پر آئی تھیں، چوکنّی ہو کر اِردگرد کے مناظر کو دیکھ رہی تھیں۔ رامو گونڈ نے چادر کو کمر سے لپیٹا، لاٹھی زمین پر ڈال دی اور ایک بھینسے پر لدے ہوئے بورے سے جس میں مکّا اور جوار کی چند تھیلیاں، نمک مرچ وغیرہ کے درجہ رڈبے، دودھ دوہنے کا برتن اور دیگر ضروری سامان تھا، ایک بڑی سی کلہاڑی برآمد کی اور آس پاس کے چند ساگوان کے درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ شام ہونے سے پہلے ہی اس کی گوارٹی تیار ہو گئی جس میں ہر شام چراگاہ سے واپس آنے کے بعد مویشیوں کو پناہ لینے کے لئے کافی گنجائش رکھی گئی تھی۔

بچپن ہی سے یہی ہوتا آیا تھا۔ رامو گونڈ اپنے گاؤں کے گوجروں کی ملازمت
کرتا تھا، ان کے کھیتوں میں ہل چلاتا، گھر کا کام کاج کرتا اور جب بارش میں خاص محنت کا
کام نہ رہ جاتا تو اُن کے مویشی اکٹھا کر کے پہاڑوں پر چرائی کے لئے نکل جاتا۔ اس کا باپ بھی یہی
کرتا تھا۔ سُنا تھا کہ کبھی اس کے باپ کے پاس اپنی زمین تھی، مویشی تھے اور وہ گوجروں کی
ملازمت پر مجبور نہ تھا لیکن تاڑی کی بُری لت اور جوئے میں سب کچھ جاتا رہا۔ رامو گونڈ
کبھی کبھی تو بُری طرح جھنجھلا جاتا۔ من ہی من میں اپنے باپ کو سیکڑوں گالیاں دیتا۔ اور
پھر خود ہی خفیف سا ہو کر رہ جاتا۔ کتنی حسرت تھی اُسے کہ اُس کا اپنا ایک چھوٹا سا کھیت ہوتا،
اپنے جانور ہوتے اور جب وہ ہل چلاتا تو اُسے احساس ہوتا کہ دھرتی ماں کے سینے سے جو
سونا برآمد ہوگی وہ اس کے اپنے لئے ہوگی۔ کسی بخیل گوجر کی بکھاری میں دفن ہونے کے لئے
نہیں۔ جن پودوں کو وہ اپنا خون سینچ کر پروان چڑھا رہا ہے۔ ان کے پھل صرف اس کے لئے
ہونگے۔ لیکن وہ حسرتیں ہی کیا جو شرمندۂ تعبیر ہوں۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا تھا کہ وہ خون
پسینہ ایک کر کے فصل تیار کرتا اور معاوضے میں گالیوں اور لاتوں کے ساتھ ناپ کر تھوڑی سی
مکا اور جوار اس کی جھولی میں ڈال دی جاتی۔ بارش بھر پہاڑوں پر اکیلے رہ کر مویشی
چراتا، ان کا دودھ اکٹھا کر کے گھی تیار کرتا۔ جن کے کنستر گوجروں اور پھر بنیوں کے توسط
سے دوسروں تک پہنچتے۔ کیونکہ رامو گونڈ قسم کے لوگ تو گھی ہضم نہیں کر سکتے۔ لیکن ان
تمام باتوں کے باوجود رامو ان گوجروں کو اپنا محسن سمجھتا تھا۔ اس کی بساط ہی کیا تھی۔
ایک معمولی حقیر گونڈ، جس کے پاس چار دانے پیدا کرنے کے لئے گز بھر زمین بھی تو نہیں تھی
وہی گوجر اس کے ان داتا تھے۔ اگر آج دولات مار کر گاؤں سے نکال دیں تو اُس کا کہاں
ٹھکانہ لگے۔ وہ واقعی گوجروں کا تہِ دل سے شکر گذار تھا!

ایک شام وہ اچار کے درخت کے نیچے بیٹھا "تورے من میں دگا باجی..."
الاپ رہا تھا اور سامنے پہاڑی کے ڈھلان پر پھیلے ہوئے مویشی چر رہے تھے کہ سامنے درختوں

کے جھنڈ سے لالہ جی برآمد ہوئے۔ پٹواریوں کی بے وقت آمد کاشتکاروں کے لئے کال کی آمد سے کم نہیں ہوتی لیکن رامو اس مرض کا مریض ہی نہ تھا۔ زمین پاس ہوتی تو کوئی بات بھی تھی اس وقت لالہ جی سے مرعوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ پٹواری صاحب نے اُس کے قریب آکر چشمہ کچھ اوپر چڑھاتے ہوئے اُسے گھور کر دیکھا پھر اپنا بستہ زمین پر لاا بالیانہ انداز میں ڈال کر اُسی پر براجمان ہوتے ہوئے اُنھوں نے پوچھا ——

"کہاں کا رہنے والا ہے رے ——!؟"

"جی حجور! مائی باپ! بھورا کھیڑی کا ہوں —" رامو نے مودبانہ جواب دیا۔

"جانور گوجر بٹیلوں کے ہونگے یہ؟"

"ہاں سرکار!"

"چرائی کے رونے (اجازت نامے) ہیں سب مولیشیوں کے؟"

"جی ہاں سرکار سب کے ہیں!"

"کوئی چیک کرنے آیا —؟"

"جی حجور فارسٹ گارڈ صاحب اور ڈپٹی رینجر صاحب دونوں کل گنتی کر گئے ہیں"۔

"اچھا۔ اچھا —" لالہ جی نے ایک بار پھر اُسے گھور کر دیکھا "گوارٹی کدھر بنائی ہے؟"

"جی سرکار وہ کولار نالے کے پرلی طرف ——"

"بارہ انچ سے موٹی لکڑی تو نہیں کاٹی کھمبوں کے لئے؟"

رامو ہچکچایا۔ مائی باپ سے جھوٹ کیا بولے۔ پھر ناپ اُسے معلوم بھی کیا۔ بولا ——

"حجور چل کے خود دیکھ لیں۔ اپنی سمجھ میں تو موٹی لکڑی نہیں کاٹی۔"

"زیادہ دُور تو نہیں ہے گوارٹی —؟" لالہ جی غرائے۔

"ناحجور! چار کدم پر ہے۔ اس سامنے والی چٹان کی آڑ میں۔"

"دودھ، دودھ بھی ہے پینے کے لئے۔ ؟"

"ہے تو ہے مائی باپ پر سکر نہیں ہے۔"

"کیا — ؟" پٹواری صاحب نے کھڑک کر کہا۔

"سرکار! گھی اور مکھن بھی ہے —" رامو نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

پٹواری کا لہجہ فوراً چکنا ہو گیا ——

"اچھا چل جلدی کر —— ہمیں شام سے پہلے ہیڈکوارٹر پہنچنا ہے"

گواڑی میں پہنچ کر پٹواری صاحب نے ڈٹ کر دودھ پیا۔ ایک اَدھی گھی کی قبضے میں کی' مویشی چرانے کی اجازت نامے پر سرسری نظر ڈالی۔ گواڑی کی نسبتاً موٹی لکڑیوں میں سے چند کو فیتے سے ناپا اور پھر مطمئن ہو کر جانے کو تیار ہوئے۔

"کیا نام ہے تیرا؟" انھوں نے چلتے چلتے دریافت کر لینا مناسب سمجھا۔

"رامو گونڈ سرکار!"

"زمین ویمن بھی ہے کچھ تیرے پاس کہ سالے مزدوری ہی کرتا ہے ؟" پٹواری جی نے پیار بھری آواز میں پوچھا۔ رامو گونڈ نے ٹھنڈی سانس لی ——

"ایسے بھاگ کہاں ججور ؟"

"ارے!" لالہ جی نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ "تیرے پاس زمین نہیں ہے اور سالے تو نے ہمیں بتایا تک نہیں! —— ہمارے ہوتے تو زمین سے محروم ہے۔ دھت تیرے کی۔ واقعی تیرے بھاگ خراب ہیں"

"تو..... تو....." رامو کو اپنا دم رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ "کیا ججور، مائی باپ، گریب پرور! ہم کو جمین مِل سکتی ہے ؟"

"سالے! مِل کیوں نہیں سکتی۔ ضرور مِلے گی' ہم دیں گے"

رامو لالہ جی کے قدموں پر گر پڑا —— اظہارِ ممنونیت کے لئے اُسے کوئی طریقہ ہی سمجھ

میں نہ آرہا تھا۔ لالہ جی مُسکرائے ______

"لیکن سالے! اس کے لئے درخواست دینی پڑتی ہے۔ بڑے صاحب کی منظوری لینی پڑتی ہے۔"

ہاتھ جوڑ کر رامو بولا ______

"ہمارے مائی باپ تو آپ ہی ہو حجور! آپ ہی درکھاس لکھ دو اور آپ ہی منظوری دِلوا دو۔"

"اچھا اچھا۔" لالہ جی نے اس کی پیٹھ تھپکی ______

"لے اس کاغذ پر انگوٹھے کا نشان لگا۔ میں تیری طرف سے درخواست لکھ کر لگا دوں گا۔"

انھوں نے ایک سادے کاغذ پہ اُس کے بائیں انگوٹھے کا نشان لیا، چائے کے ٹکڑے پھر پلیٹ کر مکھن کے ایک ڈبّے کی طرف دیکھنے لگے جو رامو نے لیک کر اُن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر چلنے کو تیار ہوئے۔ رامو ہاتھ باندھے اُن کے پیچھے ہولیا۔ اُس کے ذہن میں اُتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔

"تو پھر سرکار! جمین کا پٹّہ مِل جائے گا نا ہم کو؟"

"ہاں بے! ہم دلائیں گے دس ایکڑ کا پٹّہ! بڑے صاحب اپنے کہنے میں ہیں دوسروں سے تو پانچ سو سے نیچے بات ہی نہیں کرتے!"

رامو کو اپنے خواب بکھرتے سے جان پڑے، پٹواری کے پیر پکڑ کر بولا ______

"حجور! آپ جانو۔ اتنے پیسے تو ہم نے کبھی کھواب میں بھی نہیں دیکھے۔"

لالہ جی ہنسے ______ "ابے بیسوں کی بات کون کرتا ہے تجھ سے؟"

"ہاں سرکار!" رامو کی آنکھیں احساسِ تشکّر سے بھر آئیں۔" آپ کے بال بچّوں کو دُعا دوں گا۔ عُمر بھر گُن گاؤں گا۔"

لیکن کل صبح ناکیدار کو میں بھیجوں گا۔ ایک اچھی سی گائے بھیج دینا بڑے صاحب کے لئے!"

پٹواری صاحب چلے گئے۔ رامو رات بھر نہ سو سکا۔ رہ رہ کر پٹواری کے لئے اس کے دل میں عقیدت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ دوسرے دن اس نے ناکیدار کے ہمراہ ایک گائے بھی بڑے صاحب کی خدمت میں بھجوادی۔ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ گوجر دس بیس لاتیں اور ماریگا۔ کہہ دیگا اس سے بچھیا گواڑی توڑ کر بھاگ گئی یا تیندوا اٹھالے گیا۔ زمین تو مل جائیگی اسے۔ اس کا جنم جنم کا خواب تو پورا ہوگا۔

تین ماہ بعد اس کا جنم جنم کا خواب پورا ہوگیا۔ اسے ایک دس ایکڑ بنجر زمین کا پٹہ سرکار کی طرف سے عنایت فرمایا گیا۔ جسے جوتنے کے لئے اس کے پاس بیل نہیں تھے، جس میں بونے کے لئے اس کے پاس بیج نہیں تھا۔ اس لئے راموگونڈ نے ایک بچھیا کے معاوضے میں وہ پٹہ لال سنگھ گوجر کے نام منتقل کر دیا۔ اور اب وہ وہی زمین لال سنگھ گوجر کے لئے اسی کے بیلوں سے ہانک رہا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اس کے دل میں پٹواری کے لئے عقیدت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جس نے صرف ایک بچھیا نذرانے میں لیکر اسے دس ایکڑ زمین کا پٹہ دلادیا تھا۔ اور لال سنگھ گوجر کا بھی احسان مند تھا جس نے بچھیا کے معاوضے میں صرف دس ایکڑ زمین کا پٹہ لیکر اسے بخش دیا تھا۔ احساسِ تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگی جارہی تھیں اور دور کہیں اس کا کوئی بھائی الاپ رہا تھا ——————

پتّے پتّے سے نکل رہی آگ رے گوریا!

بردا بردا سے لپٹ رہے ناگ رے گوریا!

(اکتوبر ۶۲ ۱۹ء)

ٹی۔ اے۔ بل

بے شک ٹی۔ اے۔ بل ہی واحد ذریعۂ نجات تھا۔

تبادلے یوں بھی پریشانی کا باعث ہوتا ہے نہ کہ بارش کے زمانے میں اور پھر وہ بھی اس علاقے میں جہاں سفر کا واحد ذریعہ ٹٹو ہو اور راستے میں گھٹنے گھٹنے برابر کیچڑ پڑتی ہو۔ طرہ یہ کہ ایسی بیوی بھی ساتھ ہو۔ جیسے قدم قدم پر ہسٹریا کے دورے پڑتے ہوں اور جنگل میں گیدڑ کو دیکھ کر شیر کا گمان گزرتا ہو۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح ان تمام منزلوں سے گزر آیا تھا۔ لیکن ایک آخری منزل باقی رہ گئی تھی ۔۔۔ روپیہ!

تنخواہ جو یوں ہی ڈیڑھ سو روپیوں تک محدود تھی: اس سفر کی نذر ہو چکی تھی اور پورا مہینہ ابھی باقی پڑا تھا۔ یہ بات نہیں کہ ادلیس کو کبھو کوں مرنا پڑا ہو۔ مہاجن سے قرض لے کر فاقہ کشی سے نجات تو مل ہی گئی تھی۔ لیکن وہ قرض سے بہت گھبراتا تھا۔ پھر اس بار تو مہاجن نے پورے پچیس روپے سیکڑہ سود پر معاملہ طے کیا تھا۔ ایسی موٹی اسامیاں بھلا روز روز کہاں ملتی ہیں۔ ادھر ادلیس پچھلے پندرہ دنوں سے یہ سوچ سوچ کر پریشان

ہو رہا تھا کہ آخر یہ قرض کس طرح ادا ہوگا۔ اگر جلد ہی اس کی ادائیگی نہیں کر دی جاتی تو دو چار سال کے لئے یہ بلا گلے منڈھ گئی۔ آہستہ رہ رہ کر اپنے اس سب کئے پر الجھن ہوتی تھی جس نے اسے اس جنجال میں پھنسایا۔ وہ پچھتانے لگا۔ کاش اگر اس نے ذرا ضبط سے کام لیا ہوتا!

بات یہ تھی کہ اس دن وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اسکول کی نئی عمارت تعمیر ہو رہی تھی جس کا زیادہ تر کام شرم دان کے طور پر اسکول کے بچے ہی کرتے تھے اور مزدوروں کی اجرت میں سے بچایا ہوا روپیہ بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر کی جیب میں جاتا تھا۔ تپتی ہوئی دوپہر میں مکمل چار گھنٹوں تک بچوں کے ساتھ تعمیر کے کام میں جتے رہنے کے بعد جب اس نے دوبارہ کلاس لگائی تو وہ تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔ بچوں کو سبق یاد کرتے رہنے کی ہدایت دے کر وہ یوں ہی تکان مٹانے کی غرض سے کرسی کی پشت پر ٹک گیا اور پھر نہ جانے کب اسے نیند نے آدبوچا۔ اور جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ سامنے ہیڈ ماسٹر رام اشیش ڈوبے کھڑے ہوئے دہاڑ رہے ہیں۔

"جی...جی......" اودیش ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"جی جی کیا کرتے ہو جی! ——— میں تمہاری بھینس کھول گیا" ڈوبے جی چیخے۔

"جی وہ ——— دراصل میں بہت تھک گیا تھا۔"

"اچھا ——— تو شاید آپ اسکول میں کولھو چلا رہے تھے۔"

"نہیں ——— اسکول کی نئی عمارت کے شرم دان کے......"

"کیا بکتے ہو ———" ڈوبے جی نے غرا کر بات کاٹ دی ——— "دیوار ابھی آدھی ہی ہے۔ ایک ہاتھ بھی اونچی نہیں اٹھی ——— جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں ———؟"

"لیکن میں سچ عرض کرتا ہوں کہ......"

"پھر وہی بحث ——— گویا تم سچ عرض کرتے ہو اور میں جھوٹ فرما رہا ہوں!"

"میرا یہ مقصد ہرگز نہ تھا۔"

"پھر کیا مقصد تھا تمھارا؟ ——— تم بالکل نکمے اور حرام خور اور ساتھ ہی ساتھ بد تمیز بھی ———"

ادیس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُس نے اُچٹتی ہوئی نگاہ کلاس پر ڈالی۔ لڑکے بظاہر اپنی سیٹوں پر دُبکے ہوئے تھے لیکن نگاہیں بچا کر کنکھیوں سے اُن کی طرف دیکھ بھی رہے تھے اور دوبے جی متواتر بُنتے جا رہے تھے ———

"آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی اور اس میں بھی کلاس میں سونا۔۔ حد ہو گئی حرام خوری کی۔"

"بھائی دوبے جی! اب بہت ہو چکا ——— لگام دیجئے اپنی زبان کو ———"

"ہیں —— کیا کہا ——— دوبے جی اپنی جگہ سے اُچھل پڑے ———"

زبان کو لگام دوں ——— چوری اور سینہ زوری! حرامزدگی کرتے ہو اور آنکھیں نکالتے ہو ——— نالائق ——— !"

اب اُدیس سے نہ رہا گیا ——— ۔

میں کہتا ہوں بند کرو اپنی بکواس: "اُس نے چیخ کر کہا ——— اور دوبے جی کو گریبان پکڑ لیا ———" اب اگر کوئی اور لفظ زبان سے نکالا تو گدی سے باہر کھینچ دوں گا۔"

ایک لمحے کے لئے تو جیسے دوبے جی کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر اُنھوں نے جھٹکا دیکر اپنا گریبان چھڑا لیا اور غیظ و جوش سے ہکلا ہکلا کر بڑبڑاتے ہوئے کلاس روم سے نکل گئے

"اچھا - اچھا - اتنی ہمت! دیکھ لوں گا:"

اُسی دن شری رام اشیش دوبے نے شری جمال قریشی ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس کو اس مضمون کا تار بھیجا

"اسسٹنٹ ٹیچر شری ادیس نے ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول لاڈکوئی کو تمام طلبہ کے سامنے گالیاں دیں اور بُری طرح مارا۔" سات دن کے اندر اندر ماسٹر ادیس کو

لاڑکوٹی سے دیوری پرائمری اسکول کے تبادلے کا حکم مل گیا اور ساتھ ہی اسے مطلع کیا گیا کہ تین سال کے لئے اس کی ترقی روک دی گئی ہے :

اور اب اس واقعہ کو ڈیڑھ مہینہ گزر گیا تھا لیکن اس کے اثرات اب تک ماسٹر اولیس کو پریشان کئے ہوئے تھے۔ اس پر یہ مہاجن کے قرض کا الگ جنجال ـــــ لیکن آخر سوچتے سوچتے اچانک اسے اپنا سفری بھتہ بنانے کی یاد آگئی اور اسے کچھ تسکین ہوئی کہ ٹی۔ اے۔ بل کی منظوری کے بعد اس کی تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ اسی دن اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ پونے دو سو میل کا ٹی۔ اے۔ بل بنا لیا جو ساڑھے باسٹھ روپے کا بنا۔

اور وہ بل کو ہیڈ آفس بھجوا کر مطمئن ہو گیا۔

لیکن ٹھیک پندرہ دن بعد جب ماسٹر اولیس نے ہیڈ آفس سے آئے ہوئے لفافے کو اس امید پر کھولا کہ اس میں پاس شدہ ٹی۔ اے۔ بل ہوگا۔ تو اس میں اسے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس کا مختصر سا خط ملا جس میں اس سے جواب طلب کیا گیا تھا کہ اس نے غلط طور پر زیادہ خرچ لگا کر ٹی۔ اے۔ بل کیوں تیار کیا۔ اور اس طرح گورنمنٹ کو دھوکا دے کر ناجائز مطالبہ وصول کرنے کی کوشش کی۔ کیوں نہ تین سال کے لئے اس کی ترقی روک دی جائے ـــــ

ماسٹر اولیس نے دن بھر کے سوچ وچار کے بعد جھکاتے ہوئے سر کے ساتھ اپنا رضامندی جواب لکھا ـــــ

جناب والا!

آنجناب کے مراسلہ نمبر ۲۴ مورخہ فلاں کے سلسلہ میں وضاحت کے طور پر مجھے عرض کرنا ہے کہ میں نے ٹی۔ اے۔ بل میں کوئی زیادہ خرچ نہیں لگائے بلکہ حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ حقیقتاً جتنا روپیہ اس تبادلے میں سفر پر میرا خرچ ہوا ہے

اتنا ہی کلیم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں حضور چاہیں تو تفتیش کر کے اپنی تسکین فرما سکتے ہیں

خادم
ماسٹر ادریس

دیوری

ایک ہفتہ بعد پھر دوسرا مراسلہ موصول ہوا۔ جس میں ڈی آئی۔ ایس نے اس سے منہ جوڑ کر تنبیہی وضاحت طلب کی تھی۔

مسٹر ادریس ہیڈ ٹیچر پرائمری اسکول دیوری جواب دیں کہ

(۱) انھوں نے سلوانی سے دیوری تک گھوڑے پر سفر کر کے محض بائیس میل کے لئے آٹھ روپے کیوں کلیم کیا۔ جبکہ ہر شخص سے جانے پر محض ایک روپیہ کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

(۲) انھوں نے دوران سفر میں تین دن کیوں صرف کئے۔ کیوں نہ سمجھا جائے کہ محض زیادہ ڈیلی الاؤنس حاصل کرنے کے لئے فرنچ کیا گیا۔

(۳) انھوں نے اپنے افسر اعلیٰ کو ماتحت سمجھ کر خط لکھنے کی جرأت کی اور اسے انکوائری کرنے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی نوٹ تھا کہ اگر مندرجہ بالا سوالات کا تسلی بخش جواب نہ دیا گیا تو ڈسٹرکٹ سب انسپکٹر آف اسکولس بنفس نفیس تفتیش کے لئے تشریف لائیں گے۔

ماسٹر ادریس نے ان سنگین الزامات کی صفائی میں منتشر دماغ کے ساتھ کچھ ایسے بوکھلائے ہوئے انداز میں پیش کی کہ واقعی انسپکٹر صاحب معہ اپنے چپراسی اور پیشکار کے دس دن بعد ہی اسکول میں وارد ہو گئے۔

اور جب ماسٹر جی نے مزید پندرہ روپے قرض لیکر ایک مرغ اور مختلف لوازمات کے ساتھ ماسٹر ادریس نے انھیں لنچ وغیرہ سے نمٹا دیا تو وہ باقاعدہ تفتیش کرنے بیٹھے۔

"ہاں تو آپ کو اپنے پہلے الزام کے بارے میں کیا کہنا ہے۔" انھوں نے اپنی بھینگی آنکھ گھما کر ادریس سے پوچھا۔

"جی ——! " ماسٹر نے گھگھیا کر کہا —— "میں لارڈ کوئی سے سلوانی تک تو بس پر ہی آیا لیکن سلوانی سے اس پہاڑی علاقے میں آنے کے لئے بارش کے زمانے میں کوئی بس نہیں تھی"

"پھر ——؟ " انسپکٹر قریشی نے بارعب آواز میں پوچھا۔

"اس لئے مجبوراً خادم کو گھوڑے کرائے پر طے کرنے پڑے ——"

"آپ پیدل چل سکتے تھے ——!"

"لیکن حضور!" ماسٹر ادریس نے وضاحت پیش کی —— "میرے ساتھ میری بیوی اور ضروری سامان بھی تھا!"

"اس کے لئے دو ایک روپیہ کا مزدور کافی ہوتا ——"

"لیکن صاحب! مزدور کے سر پر میری بیوی کس طرح آسکتی تھی؟" ماسٹر بوکھلا کر بولا۔

"ہوں ——! " انسپکٹر صاحب سگریٹ کا طویل کش لے کر بولے ——
"گورنمنٹ یہ سب نہیں دیکھتی۔ اگر ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ پانے والے ہر ملازم کے تبادلے پر اتنی لمبی رقموں کے ٹی۔ اے۔ بل پاس کئے جانے لگیں تو حکومت کا کام چل چکا —— اور ہاں —— دوسرے الزام کے بارے میں کیا جواب ہے آپ کے پاس؟"

"جی صاحب! دراصل لارڈ کوئی سے سلوانی تک سفر کے دوران تین بار موٹر بس تبدیل کرنی پڑتی ہے۔" ادریس نے بہت انکسار کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہے —— سوال یہ ہے کہ آپ نے دوران سفر میں تین بیان کیوں صرف کئے؟ کیا اس سے محض زیادہ ڈیلی الاؤنس کا مطالبہ کرنے کی غایت مدنظر تھی۔"

"جی ہرگز نہیں ——" ادیس گڑگڑایا —— " ہر دو ٹرمیس میں میں سوار ہوا'
اس وقت دوسرے مقام پر پہنچی۔ جب تیسرے مقام کو جانے والی بس چھوٹ چکی ہوتی۔
میں رات کو قیام کرنے پر مجبور رہتا!"

جمال قریشی صاحب، سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے بولے ——

"آپ کو ایسی موٹروں میں سفر ہی نہ کرنا تھا ——"

"لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا حضور!"

"یہ بھی کوئی جواب نہ ہوا —— دو الزامات آپ پر ثابت ہو گئے۔ تیسرے کے بارے
میں کیا کہنا ہے آپ کو؟"

ماسٹر اویس ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا ——

"حضور! میری کیا مجال کہ اپنے افسروں کو کسی قسم کا حکم دوں۔ میں نے تو
اپنے مراسلے میں صرف یہ درخواست کی تھی کہ اگر حضور کو میری بات پر یقین نہ ہو تو بذاتِ خود
تفتیش کر کے اطمینان فرما سکتے ہیں"

"اگر براہِ راست نہیں تو بالواسطہ یہ جملہ صریحاً ایک حکم ہے۔" انسپکٹر صاحب
غرائے۔

"میں عرض کر چکا ہوں حضور کہ میری اتنی مجال نہیں!" اویس گڑگڑا کر بولا۔

"تو اس کا یہ مطلب ہے ——" انسپکٹر جمال قریشی آنکھیں لال پیلی کرتے
ہوئے بولے —— "کہ میں ابھی حرف دخر سے بھی ناواقف ہوں اور کسی جملے کا صحیح مطلب
بھی نہیں سمجھ سکتا اور اتنے بڑے ضلع کے سبھی اسکولوں کا انتظام یوں ہی ہو جاتا ہے
—— کیوں؟"

شدتِ غضب سے انسپکٹر صاحب کے منہ سے کف اڑنے لگا۔ سگریٹ کو زور سے
زمین پر پھینک کر پیر سے مسلتے ہوئے اکڑوں لینے، پھنکار کو حکم صادر فرمایا ——

"ماسٹر اولیس کے کیریکٹر رول میں درج کر دو کہ یہ بہت زبان دراز آدمی ہے ـــ"

"حضور! میں ...." ماسٹر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنا چاہا ـ

"خاموش ـــ ورنہ آپ پر انتظامی معاملات میں دخل انداز ہونے کا چارج بھی لگ جائے گا ـ" انھوں نے ماسٹر کو پھٹکارا اور پھر پیشکار سے مخاطب ہوئے ـــ

"یہ بھی لکھو کہ یہ سخت غیر ذمہ دار آدمی ہے اس لئے اس کی پانچ سال کی ترقی روکی جاتی ہے ـــ"

"حضور ـــ" ماسٹر اولیس نے ہاتھ جوڑ کر کچھ عرض کرنا چاہی ـ

"تم پھر بولے ـــ!" انسپکٹر جمال قریشی نے اپنی بھینگی آنکھیں گھمائیں ـــ"

"پیشکار!"

"جی سرکار!"

"لکھو کہ ماسٹر موصوف انتظامی معاملات میں مداخلت کا بھی عادی ہے ـ اس لئے مزید دو سال کی ترقی روکی گئی ـــ"

انھوں نے نظر گھما کر ماسٹر کی طرف دیکھا لیکن اسے اب اور کچھ کہنے کی تاب نہ تھی لہٰذا وہ پھر پیشکار کی طرف مخاطب ہوئے ـــ

"لکھ چکے ـــ ٹھیک ہے ـــ لاؤ دستخط کر دوں!"

اور دستخط ثبت کر چکنے کے بعد فرمایا ـــ

"ان کے ٹی ـ اے ـ بل پر نوٹ لگا دو کہ تفتیش کرنے پر مطالبہ ناجائز ثابت ہوا اس لئے بل نامنظور کیا جاتا ہے!"

اور پھر اولیس کو ہکا بکا چھوڑ کر وہ لوگ روانہ ہو گئے ـ

تین دن بعد اپنے دفتر پہنچ کر شری جمال قریشی ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس نے اپنی ہفتہ وار سرکاری ڈائری میں ایک ناجائز ٹی ـ اے ـ بل کی تفتیش کر کے اسے

رد کرنے کی کارگزاری بڑھا چڑھا کر درج کی اور ڈائرکٹر صاحب تعلیمات کو اُس کی نقل فارورڈ کردی جس کے ساتھ تین ٹی۔اے۔بل منسلک تھے۔

انکوائری کے سلسلے میں انسپکٹر موصوف کا ٹی۔اے۔بل۔مبلغ تین سو بارہ روپے آٹھ آنے!

بیانات درج کرنے کے لئے ساتھ جانے والے پیشکار کا ٹی۔اے۔بل۔مبلغ ایک سو تیرہ روپے چار آنے!!

اردلی کا۔ٹی۔اے۔بل۔مبلغ ستر روپے بارہ آنے!!!

(مارچ سنہ ۵۲ء)

اونچی دوکان

مسز انجم شاپنگ کے لئے تیار ہو کر پرس لٹکائے ہوئے باہر آئیں اور انتظار کرتی
ہوئی کار کے پچھلے گدے میں دھنس گئیں ——

"برہانہ روڈ!"

شوفر نے موٹر اسٹارٹ کی اور چمکتی ہوئی نئی کار موڑ گھوم کر جلد ہی مال روڈ پر ہجوم کے
درمیان رینگنے لگی۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔

کالج کے لڑکے، ماڈرن لڑکیاں اور مل مزدوروں کی ٹولیاں سڑکوں پر
منڈلا رہی تھیں۔ کیفے، ریسٹوران اور کولڈ ہاؤس کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ سینما کے
بکنگ آفسوں کے سامنے لوگ قطاریں باندھے کھڑے تھے۔ چوراہے پر اتنی گہما گہمی تھی کہ
سائڈ کے لئے سگنل دیتے دیتے سپاہی کے ہاتھ شل ہو گئے تھے اور وہ تھکن دور کرنے کے
لئے پاس ہی رشید چائے والے کی گمٹی پر کھڑا گرم چائے کی پانچویں پیالی اپنے حلق میں
انڈیل رہا تھا۔ تبھی مسز انجم کی کار ہارن دیتی ہوئی اور ایک ابالطی کی ہانپتی پھرتی دوکان
کو جو اس نے ہاتھ ٹھیلے پر سجا رکھی تھی، ٹکر دیتے گراتی ہوئی سن سے نکل گئی۔ ابالطی کا
تمام سامان سڑک پر بکھر گیا۔ آوارہ لڑکے چیزیں لے کر بھاگنے لگے اور جب وہ ایک لڑکے

سے اپنی ٹارچ چھیننے کے لئے جھپٹا تو سامنے سے آتی ہوئی ایک رکشا سے ٹکر ہو گئی۔ بس اطی جلا بھنا تھا اور رکشے والا تھکا ماندہ۔ اس حادثے نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ دونوں کے منہ سے بیک وقت گالیوں کے فوارے اُبل پڑے۔ شور و غل سُن کر سپاہی نے باقی چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اُتاری جس سے اس کا مُنہ جُھلس گیا۔ اُس نے جلدی سے اپنی پھٹی ہوئی میلی نوٹ بک نکالی اور اُن کے قریب آکر نام پوچھنے لگا جیسے چالان کئے بغیر ہرگز نہ مانے گا اور جلد ہی اس کی جیب میں پانچ پانچ کے دو نوٹ کھڑکھڑانے لگے۔!

اگلے چوراہے پر دائیں طرف مُڑ کر کار مال روڈ سے برہانہ روڈ پر آگئی، سر بفلک عالیشان عمارتیں چوڑی چکلی سڑک پر ہر دو جانب کھڑی تھیں۔ طرح طرح کے سائن بورڈز دکانوں پر آویزاں تھے۔ کار ایک اونچی عمارت کے سامنے جا کر رُک گئی جس پر "یونیورسل سلک۔ اسٹور" کا سائن بورڈ لٹک رہا تھا۔ شوفر نے ایک کر پچھلا دروازہ کھولا اور مسز انجم کار سے نکل کر متانت کے ساتھ کھٹ پٹ کرتی ہوئی زینے پر چڑھ گئیں۔

زینہ پار کر کے جیسے ہی انھوں نے ہال میں قدم رکھا، منیجر لپک کر آیا ــــــ

"گڈ ایوننگ مسز انجم"

"گڈ ایوننگ"

"کہیئے کیسے تکلیف کی؟"

"یوں ہی ــــــ چند ساریوں کی ضرورت تھی۔ سوچا آرڈر دیتی جاؤں۔"

"ناحق زحمت فرمائی آپ نے ــــــ فون پر حکم دے دیا ہوتا، ساریاں خدمت میں حاضر ہو جاتیں۔"

منیجر الکٹن سے کر شو ہال میں آیا۔ چھ ساریاں مسز انجم نے پسند کیں جن کا پیکٹ کار پر پہنچا دیا گیا۔ کاؤنٹر پر آکر انھوں نے بل لیا اور اٹھارہ سو سات روپے کا چیک لکھ کر کلرک کے حوالے کیا اور نیچے آکر پھر کار میں بیٹھ گئیں ــــــ

اد پر کلرک نے منافع کے کالم میں نو سو سات روپے درج کر لئے۔

ہجوم بڑھ گیا تھا۔ سڑک قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ ریڈیو فضا میں موسیقی بکھیر رہے تھے۔ مسز انجم نے ڈرائیور کو کملا کلب چلنے کو کہا اور "بیوٹی" کا تازہ شمارہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگیں۔ ایک جنسی افسانہ خاصہ دلچسپ تھا۔ افسانہ ختم کر کے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کار کلب کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہی ہے۔

گیٹ پر ایک بوڑھا پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک ٹوکری میں تازہ انگور لئے بیٹھا تھا۔ انگور دیکھ کر مسز انجم کو خیال آیا کہ وہ بے بی کے لئے چوکلیٹ خریدنا تو بھول ہی گئیں اُن کا پروگرام بارہ بجے رات تک کلب میں ٹھہرنے کا تھا۔ کچھ سوچ کر انھوں نے کار رکوائی اور شوفر سے کہا ——

"اُس بوڑھے کو بلاؤ —— بے بی کے لئے انگور ہی لے لیں ——"

"اے بوڑھے میاں!" شوفر نے آواز دی —— "میم صاحب کو انگور دکھلا دے"

بوڑھا لپکا ہوا آیا۔ دل میں سوچ رہا تھا آج قسمت مہربان معلوم ہوتی ہے۔ میم صاحب کو انگور پسند آگئے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اُس نے قریب آکر ایک خوشہ لٹکاتے ہوئے کہا ——

"مالکن! بالکل تازے ہیں آج ہی چمن سے آئے ہیں۔ پوری ٹوکری لے لیجئے۔ پندرہ روپیوں میں ہی دے دوں گا ——"

مسز انجم نے ایک انگور چکھ کر دیکھا۔ واقعی تازہ اور میٹھے تھے۔ بولیں ——

"اچھا سب ہی لے لیں گے —— دس روپیوں میں دے گا؟"

دام کم تھے۔ بوڑھے کو صرف چھ آنے بچ رہے تھے لیکن اُس نے سوچا رات ہو رہی ہے اور کل بیوپاری بغیر پیسے لئے مال نہ دے گا۔ چلو یہی غنیمت ہے۔ بولا! ——

"نقصان ہے لیکن خیر لائیے ———"

ڈرائیور نے ٹوکری اندر رکھ دی۔ مسز انجم نے ایک دوسرا نوٹ اٹھالیا۔ پھر برس سے دس روپے کا نوٹ نکال کر بوڑھے کو دیتے ہوئے ایک انگور دانتوں سے توڑ لیا۔ انگور تدرے ترش تھا، بوڑھا واپس جا ہی رہا تھا کہ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ اس سے چھین لیا اور انگور کی ٹوکری اٹھا کر باہر پھینک دی ———

"دغا باز ——— کمینے! دھوکا دیتا ہے ———"

کار جا چکی تھی۔ انگور ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر بکھر گئے تھے اور بوڑھا حسرت سے اُن کی طرف دیکھتا کھڑا تھا!

(دسمبر ۵۳ء)

گاندھی میموریل ہاسپٹل

یہ گاندھی میموریل اسپتال ہے بھائی ؟

ہاں بھیّا۔ یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے !

گاندھی میموریل ہاسپٹل میرے گھر کے نزدیک ہے۔ گاندھی جی نے اپنی ساری
زندگی ہندوستان کی غریب جنتا کی بے غرض سیوا میں گذار دی۔ لیکن ان احسانات کے بدلے
میں ایک پاگل ہندوستانی نے اُن کا سینہ، جس میں قوم، ملک اور اُس کے باشندوں کا
درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، پستول کی گولیوں سے چھلنی کر دیا۔

اور یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے۔!

اسے گاندھی جی کی یاد میں قائم کیا گیا ہے ـــــ یہ ہمارے پوجیہ باپو کی یادگار ہے۔

یہاں غریب دکھی ہندوستانی جنتا کی بے غرض خدمت کی جاتی ہے۔

پیپ بہتے ہوئے کانوں کا یہاں علاج کیا جاتا ہے۔

گلے اور حلق کے جملہ امراض میں مبتلا مریض یہاں شفا پاتے ہیں۔

اور جسم کے سب سے قیمتی عضو یعنی آنکھ کے امراض کی یہاں بطور خاص دیکھ
بھال کی جاتی ہے۔

اور اس کے علاوہ بھی بھاوت کی غریب دکھی جنتا کے ہر مرض کی بے غرض
سیوا کی جاتی ہے یہاں۔

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!

یہاں تین ڈاکٹر کام کرتے ہیں۔

بڑے ڈاکٹر صاحب انگلینڈ رٹرنڈ ہیں اور انگلستان سے انہیں اتنا پیار ہے
کہ وہ وقت بیوقت اسی کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں اور اس پیار کی تجدید کے
لئے ہر سال انگلینڈ ضرور جاتے ہیں۔ انہیں کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ وہ ہر سال اس لئے
انگلینڈ جاتے ہیں کہ میڈیکل سائنس سے متعلق نت نئے تجربات سے واقفیت حاصل
کر سکیں، چنانچہ اس کے سالانہ آمد و رفت کے اخراجات حکومت برداشت کرنے پر مجبور ہے!

بچپن میں سنا تھا کہ بنگالہ کا جادو بھی سال میں ایک بار ضرور جگایا جاتا ہے
ڈاکٹر بھی کیا کسی جادوگر سے کم ہوتے ہیں؟

چاہیں تو پل بھر میں اچھے بھلے انسان کو مار ڈالیں۔
(مرتے ہوئے کو جلانے کی بات پر سوچنا ہوگا!)

اور یہ نہ بھولئے
____

"یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!
بڑے ڈاکٹر کے علاوہ یہاں دو اسسٹنٹ سرجن بھی ہیں۔
ایک ایم۔بی۔بی۔ایس ہیں۔
اور دوسرے ایل۔ایم۔پی۔
لیکن اسپتال میں ایل۔ایم۔پی کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔
اور وہ صاحب جو ایم۔بی۔بی۔ایس ہیں۔ایل۔ایم۔پی سے خوف
کھاتے ہیں۔

کیونکہ نااہل ہونے کے باوجود حضرت۔ ایل۔ ایم۔ پی بڑے ڈاکٹر کی سالی کے دیور ہیں۔
اور بڑے ڈاکٹر سے بگاڑ کر کے اس اسپتال میں بھلا کون ٹھہر سکتا ہے؟

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!

اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ بڑے ڈاکٹر ایک چھوٹے سے کمپاؤنڈر سے دبتے ہیں!

وہ صرف سوا سو روپے کماتا ہے ایک ماہ میں۔

لیکن اُس کا چچازاد بھائی ہیلتھ سکریٹری کے ہاں خانساماں ہے۔

اور لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ صرف خانساماں ہی نہیں،

سکریٹری کی مونچھ کا بال بھی ہے۔

ورنہ بھلا بڑے ڈاکٹر اس دو ٹکے کے کمپاؤنڈر سے دبنے والے تھے۔

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!

تین ڈاکٹروں اور کمپاؤنڈروں کے علاوہ یہاں سات میل نرس اور چار نرسیں ہیں۔

اور اُن میں ہمیشہ بڑے تگڑے قسم کا رومانس چلا کرتا ہے۔

چاروں نرسیں اُسی کمپاؤنڈر پر مرتی ہیں جس کا بھائی خانساماں ہے۔

کیوں کہ وہ نوجوان بھی ہے اور خانساماں کا بھائی بھی — یعنی چپڑاسی اور وزیر

لیکن وہ پاگل اس سانولی سلونی بھنگن پہ مرتا ہے جو ہاسپٹل کے مریضوں کا گند

صاف کرتی ہے۔

اور اس طرح عشق کا یہ چکر چلتا رہتا ہے۔

اور اسپتال کا اسٹاف بڑی تندہی اور جانفشانی کے ساتھ بھارت کی غریب اور

دکھی جنتا کی سیوا کرتا رہتا ہے۔

بے غرض سیوا ——

ہاں بھائی کیوں نہ ہو۔

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!
لیکن بھارت کی یہ غریب دکھی جنتا بڑی محسن کش ہے۔
احسان فراموش ہے
اور پاگل بھی۔
اس نے واقعی اپنے سب سے بڑے محسن اور انسانیت کے علمبردار کو گولی مار دی تھی
اور اب یہ گاندھی جی کی یاد میں قائم کئے ہوئے اس اسپتال کے اسٹاف کے خلوص
اور بے غرض خدمت کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔
حالانکہ یہاں سب کی ایک دم بے غرض سیوا کی جاتی ہے۔
لیکن غضب خدا کا ______
بھارت کی پاگل جنتا کو شک ہے ______
کہ ڈاکٹر صاحب انہیں لوگوں کا علاج جانفشانی سے کرتے ہیں جو اُن کی مٹھی گرم
کر سکتے ہوں۔
کتنے نالائق ہیں ہندوستان کے عوام۔
شاید انھوں نے اسپتال میں جابجا لٹکے ہوئے بورڈ نہیں دیکھے۔
جن پر نمایاں حروف میں لکھا ہوا ہے ______
یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے۔!
یہاں آنکھ، ناک، کان اور گلے کے امراض کا علاج خاص طور پر کیا جاتا ہے
رشوت لینا اور دینا دونوں جُرم ہیں۔
(میرے خیال میں لفظ "دونوں" حشو ہے!)
آپریشن روم!
لائن لگا کر دعا لیجئے۔

فرش پر تھوکنے سے بیماری پھیلتی ہے

یہاں ہر مریض کی بے لوث خدمت کی جاتی ہے۔

کسی قسم کا انعام، مشورے کی فیس یا دوا کی قیمت ہرگز نہ دیجئے۔

تندرستی ہزار نعمت ہے۔

برائے مہربانی خاموش رہیئے۔

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!

اتنے سارے بورڈز تو لٹکتے ہیں یہاں۔
کسی کو دکھائی نہ دیتے ہوں تو وہ اپنی آنکھوں کا علاج کرائے۔

یہاں آنکھوں کا بھی تو مفت ہی علاج ہوتا ہے۔

لیکن پاگل جنتا کو کسی بھی طرح اطمینان نہیں۔

روزانہ سیکڑوں شکایتی درخواستیں ڈائرکٹر صاحب کے پاس پہنچتی ہیں۔

طرح طرح کی شکایتیں۔

دونوں اسسٹنٹ نسخہ لکھنے سے قبل پانچ روپے لیتے ہیں۔
اسپتال کی دوا کی جگہ تمام دوائیں بازار سے خریدنے کی ہدایت کرتے ہیں اور یہ دوائیں

صرف گاندھی میڈیکل اسٹورز میں ملتی ہیں۔
لوگوں کو وہم ہے کہ گاندھی میڈیکل اسٹورز بڑے ڈاکٹر صاحب کی ملکیت ہے
اور وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!

اور یہ کہ گاندھی میڈیکل اسٹور میں فروخت ہونے والی دوائیں اسی اسپتال سے اٹھا

کی ہیں۔

لوگوں کی سمجھ ایسی الٹی ہے کہ کچھ تو صاف صاف کہتے ہیں کہ جی نہیں۔

اس اسپتال کی قیمتی دوائیں گاندھی میڈیکل اسٹورز سے آتی نہیں بلکہ وہاں جاتی ہیں
لوگ اکثر شکایت لکھتے ہیں
کہ اسپتال کے کمپاؤنڈر، اور نرسیں لوگوں کے گھر جاکر معائنہ کرتے ہیں۔
اور اپنی فیس زبردستی وصول کرتے ہیں۔
اور وہ کمپاؤنڈر جس کا بڑا بھائی ہیلتھ سکریٹری کا خانساماں ہے ــــ
(نوٹ کیجئے ــــ خانساماں یعنی مونچھ کا بال!)
تو وہ کمپاؤنڈر بوتلوں سے اصل مکسچر چرا کر پانی بھر دیتا ہے اور وہ دوائیں بیچ کر طرح طرح
کے قیمتی تحفے خریدتا ہے۔

اور وہ سانولی سلونی بھنگن موج اڑاتی ہے۔
اور اس بھنگن کے پڑوس میں رہنے والے ہیڈ ماسٹر صاحب (جو روپیہ لیکر لڑکوں کو پاس
کرنے کے سلسلے میں خاصے نیکنام ہیں) کہتے ہیں۔
بھنگن کے پاس میری بیوی سے زیادہ زیورات ہیں۔
واہ صاحب واہ!
بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ۔؟
وہ بھی اپنی بیوی کو کسی کنوارے کمپاؤنڈر سے عشق لڑانے کی اجازت دے کر دیکھیں ــــ
بھنگن سے زیادہ زیورات بن جاتے ہیں یا نہیں اس کے لئے۔
لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کمپاؤنڈر کسی خانساماں کا بھائی ہو۔
اور اُن کی بیوی بوڑھی نہ ہو۔
بدصورت نہ ہو۔
اوہ!
میں ہیڈ ماسٹر کے یہاں کیسے پہنچ گیا۔

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے۔

میں نے کہا نا! ــــ

ہندوستان کی غریب جنتا پاگل بھی ہے!

اُس نے حقیقتاً اپنے محسنِ اعظم گاندھی جی کو گولی مار دی تھی۔

اور اب اُنکی یاد میں بنے ہوئے اسپتال کے کارکنوں پر الزام تراشتی ہے۔

سب سے بڑا الزام اس اسپتال کے ڈاکٹروں پر یہ ہے۔

کہ ڈاکٹر دو چار سو روپے لے کر اسقاطِ حمل کرا دیتے ہیں۔

ہائے ــ ہائے۔

ہندوستان کی غریب دکھی جنتا کتنی پاگل ہے۔

اُسے یہ بھی علم نہیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی ملک کے لئے کتنی پریشانی کا باعث ہے۔

اور اگر ڈاکٹر ناجائز اولاد کی پیدائش کا انسداد کرتے ہیں تو ٹھیک!

اس میں ان کی کیا تقصیر؟

یہ تو پاگل جنتا کا قصور ہے۔

اور افسوس کہ اس غلطی کا خمیازہ میں بھگت رہا ہوں۔

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!

اور مجھے یہاں تفتیش کے لئے آنا پڑا ہے۔

جو درخواستیں اس اسپتال کے خلاف ڈائرکٹر صاحب کے پاس پہنچی ہیں اُن کے بارے

میں انھوں نے چند خاص ہدایات دے کر مجھے یہاں بھیجا ہے۔

اور مجھے تفتیش کے بعد مفصل رپورٹ دفتر میں داخل کرنی ہے۔

اور ڈائرکٹر صاحب نے رخصت کرتے ہوئے مجھے خاص طور پر کان میں کہا ہے ــــ

ہوشیار!

اسپتال کے کارکن بڑی بڑی ہستیوں کے آدمی ہیں۔

اور بڑے ڈاکٹر صاحب میرے خاص دوست ہیں۔

اور میں یہاں تفتیش کے لئے آگیا ہوں۔

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے

اوہ۔

میں یہ کیا سُن رہا ہوں؟

ڈاکٹر صاحب! میرے کان میں درد ہے۔

نکالو پانچ کا پتّہ!

صاحب! یہ گلے کی گِلٹیاں تو ٹھیک ہی نہیں ہوتیں؟

تم نے روپئے دیئے تھے؟

پورے دِن کا حمل ہے۔

میری ناک کٹ جائے گی ڈاکٹر صاحب!

ایک ہزار ہونگے!

نرس! اسے پنسلین کا انجکشن دو۔

صاحب! وہ سب تو گاندھی میڈیکل اسٹورز پہنچا دیے گئے۔

کنگن ہوتو کیا ہوا ڈارلنگ! کل تین بوتلیں بکی ہیں۔ یہ رہے اٹھائیس روپئے!

اور سامنے بورڈ لٹک رہے ہیں۔۔۔

یہاں آنکھ، ناک، کان کا علاج خاص طور پر کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب! میرے کان دیکھئے۔ صرف غلط باتیں سُنتے ہیں۔

نکالئے پانچ کا پتّہ!

آئے باہر سے خُدا!

حیران ہوں رپورٹ میں کیا لکھوں۔

اب تک کاغذ پر ایک حرف نہیں لکھا۔

گاندھی جی ہوتے تو ایسے اسپتال کو ڈائنامیٹ سے اُڑانے کی سفارش لکھتے۔

لیکن میں تو ایک عام آدمی ہوں۔

اور سامنے بورڈ پر موٹے موٹے حروف چمک رہے ہیں۔

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!

اور میں رپورٹ پر لکھ رہا ہوں

یہ گاندھی میموریل ہاسپٹل ہے!

(اگست ۱۹۵۵ء)

سبز روشنی

کلارک نے دور کہیں دو بجائے۔

اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ تاریک سڑک پر سبز طارچ تین بار لہرا کر بجھ گئی۔ سیما کا روم روم جھوم اُٹھا۔ آج قسمت نے اُس کی بے لطف اور معاند زندگی کو آگے بڑھنے کا سگنل دے دیا تھا۔

اُس رات "بیلی کوٹھی" کو دُلھن کی طرح سجایا گیا تھا۔ کوٹھی کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔ لیکن سیما کے لئے وہ رات کتنی تاریک تھی۔ دِل نے آشاؤں کے سارے دیپک بجھا دیئے تھے اور اُس کے سینے میں سسک رہا تھا۔

وہ اُس کی سہاگ رات تھی!

کون، دبے پاؤں، کب، اس کے کمرے میں داخل ہوا، اُسے پتہ نہ چلا۔ کس نے، کب اُس کا گھونگھٹ اُلٹ دیا، اُسے احساس تک نہ ہوا۔

"سیما!" کسی نے بڑے پیار سے سرگوشی کی۔

اور وہ یادوں کے بھیانک جزیروں میں بھٹک رہی تھی ــــ

اسلم! اسلم! کہاں ہو تم؟ تم کہاں ہو اسلم! یہ تم کہاں چھوڑ گئے اپنی سیما کو؟

"سیما ۔۔۔!" کسی نے رُوح کی تمام تر شیرینی اُس کے کانوں میں انڈیلنی چاہی۔

"اسلم ۔۔۔!" روتے ہوئے دِل نے آواز دی۔

"سیما ۔۔۔!" اس بار سرگوشی کے ساتھ ساتھ اُسے اپنے داہنے رُخسار پر بھیگی بھیگی سانسیں ٹکراتی ہوئی محسوس ہوئیں اور پھر ہونٹوں پر زندہ کیچوے سے رینگنے لگے۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ۔۔۔۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

سُلگتے ہوئے ہونٹ اُس کی آنکھوں کے بہت نزدیک لرز رہے تھے اور اُس کا "شوہر" جاوید اپنی بوجھل نشیلی پلکوں کو بڑے جذباتی انداز میں جھپکا رہا تھا۔۔۔۔

"کیا بُرا مان گئیں سیما؟" اُس نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

تب تک سیما کو اپنے پاگل پن کا احساس ہو چکا تھا۔ یہ اُس کی شبِ عروسی تھی۔ اور اس وقت وہ اپنے مجازی خدا کی بارگاہ میں تھی۔

"کون کہتا ہے اِس دَور میں انسان کی قربانی نہیں ہوتی ۔۔"

"آں ۔۔۔۔" جاوید نے اپنے کان اُس کے لبوں سے لگا دیئے۔

"جی ۔۔۔ جی ۔۔۔ میں ۔۔۔" وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر سِسکنے لگی۔

جاوید بوکھلا گیا ۔۔۔۔

"لیکن بات کیا ہے سیما ۔۔۔؟"

"جی میں بہت شرمندہ ہوں ۔۔۔" اُس نے سسکیوں کے درمیان بمشکل یہ الفاظ ادا کیے۔

"پگلی!" جاوید کی باچھیں کھل گئیں "حُسن تو منفعل ہو کر اور بھی تیکھا ہو جاتا ہے۔"

اور شبِ عروسی کا وہ تیکھا حُسن آج تک تیکھا تھا۔ سیما ہزار کوشش کے

باوجود جاوید کے لیے اپنے دل میں کوئی جگہ نہ نکال سکتی تھی اور دل میں جگہ ہوتی بھی کہاں سے اس کے ہر گوشے پہ تو اسلم قابض تھا۔

اسلم!

جو سیما کا بچپن کا ساتھی تھا جس کے ساتھ اُس نے عمر کی سترہ بہاریں گزاری تھیں بچپن کے وہ سنہرے دن، جوانی کی وہ رنگین راتیں جو سیما نے اسلم کے ساتھ بتائی تھیں، اس کی متاع زیست تھیں۔ اسلم کا شگفتہ چہرہ، چلبلی حرکتیں، شوخیاں ــــ یہی خصوصیات وہ اپنے شوہر میں چاہتی تھی لیکن وہ تو فلسفہ کا پروفیسر تھا اور فلسفہ کا پروفیسر کوشش کرنے پر اسپنسر اور مارکس تو بن سکتا تھا، اسلم نہیں۔ وہ جاوید کی محبت میں خلوص کی گہرائیاں تو محسوس کرتی تھی لیکن اُس میں اسلم کے جذبات کی سی گرمی نہ تھی۔ اُس نے کئی بار پوری کوشش کی کہ اگر خلوصِ دل سے نہیں تو کم از کم ظاہری گرمجوشی کے ساتھ ہی جاوید کی محبت کا جواب دے سکے لیکن وہ اپنے دِل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ جسمانی طور پر جاوید سے قریب تھی لیکن اس کی رُوح اسلم کے خیالی پیکر کے گرد دیوانہ وار چکر کاٹتی ــــ اور اسلم ــــ؟

خدا جانے وہ اتنے طویل عرصے سے کہاں غائب تھا؟ چار سال قبل اُس کے لیے اسلم کا پیغام آیا تھا۔ جسے منظور کرنے کے لئے سیما کی ماں نے یہ شرط عائد کی تھی کہ لڑکے کو کسی اچھی جگہ ملازم ہونا چاہیئے۔ اور پھر اسلم اس سے جدا ہو کر ملازمت کی تلاش میں نِکل کھڑا ہوا تھا۔ پھر مسلسل دو سال تک اُس کی خبر نہ ملنے پر سیما جاوید کو سونپ دی گئی تھی موٹے موٹے ہونٹ اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے اس سیاہ فام اور پستہ قد فلسفے کے پروفیسر کی جو اسلم کی ضد تھا۔ سیما نے ازدواجی زندگی کے یہ دو سال کانٹوں کی سیج پہ گزارے تھے دِن اور رات کا کوئی ایک لمحہ بھی تو ایسا نہ تھا جب اسلم کی یاد نے اس کے دِل کا دامن چھوڑا ہو۔ اُس کی بے لطف زندگی ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی تھی۔ اُسے اسلم کا انتظار تھا۔

اور آج سبز ٹارچ نے تین بار لہرا کر اُس کی بے لُطف اور جامد زندگی کو آگے بڑھنے کا سگنل دے دیا تھا!

ہُوا یُوں کہ پرسوں دوپہر کو اُس نے سامنے والی کوٹھی کے نئے کرایہ دار کی جھلک دیکھ لی تھی اور وہ اس کے من پسند کا دیوتا اسلم تھا۔ پھر مزید وقت ضائع کئے بغیر اُس نے کل دوپہر میں اسلم سے مِل کر تمام معاملات طے کر لئے تھے۔ سیما کے دریافت کرنے پر اسلم نے بتایا تھا کہ وہ "اچھی سی ملازمت" حاصل کرنے کے لئے سرکار کی طرف سے ٹریننگ حاصل کرنے امریکہ چلا گیا تھا۔ ملازمت چونکہ محکمۂ دفاع سے تعلّق رکھتی تھی اس لئے اُسے زیادہ خط و کتابت کرنے کی اجازت نہ تھی اور اب کہ ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی، وہ اس شہر میں ایک اعلیٰ آفیسر کی حیثیت سے وارد ہوا تھا۔

اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت آج صبح سے ہی سیما نے رو رو کر گھر سر پر اُٹھا لیا تھا۔ اُسے جانے کیوں آج اپنی بھُولی بسری خالہ زاد بہن یاد آ رہی تھی جو احمد آباد میں بیوگی کے ایّام گزار رہی تھی اور پھر مجبوراً شام کی گاڑی سے جاوید کو اُسے لانے کے لئے احمد آباد روانہ ہونا پڑا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ سیما خود اُسے پلیٹ فارم تک پہنچا کر آئی تھی۔

اور اب سڑک پر سبز ٹارچ تین بار لہرائی تھی۔

اُس نے سنگھار میز سے اپنا پرس اور مسہری کے نیچے سے سوٹ کیس اُٹھایا اور تیزی سے تاریک زینہ طے کر کے سڑک پر آ گئی۔

سبز ٹارچ قریب آنے لگی۔

"اسلم!" وہ فرطِ مسرت سے بیخود ہو کر ٹارچ کی طرف لپکی۔

"سیما ___!" عقب سے جاوید نے پکارا

وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی ______

"اس تاریک رات میں سڑک پر کیوں بھٹک رہی ہو سیما؟! اور یہ سبز روشنی کیسی ہے؟"

"لیکن..... لیکن....." سیما نے آواز سنبھال کر بات بنانے کی کوشش کی۔

"تم تو احمد آباد گئے تھے پروفیسر؟"

"آج گاڑی پورے بارہ گھنٹے لیٹ ہے ___ پل ٹوٹ گیا ہے کوئی مگر سیما تم......."

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ ایک شعلہ سا لپکا لیکن وہ سبز نہیں سرخی مائل نیلا تھا۔

دھماکے کی آواز سے سڑک گونج اٹھی اور رجاوید سڑک پر گر کر تڑپنے لگا۔
اسلم جھپٹ کر سلام ٹھکیٹنے لگا ___

"چلو بس ___ جلدی کرو ___ بڑا خطرناک موقع ہے۔"
سیما نے شیرنی کی طرح غرّا کر اس سے اپنی کلائی چھڑا لی ___

"درندے..... کمینے! دور ہو جا میری نگاہوں کے سامنے سے!" وہ چیخ کر بولی اور رجاوید کی لاش کے سرہانے بیٹھ کر اپنی چوڑیاں توڑنے لگی!

(ستمبر ۱۹۵۵ء)

اٹھارویں لڑکی

"اگر میں شاعر یا ادیب ہوتا تو........"

اُس نے ایک سرد سانس بھری اور خاموش ہو گیا۔

"اگر آپ شاعر ہوتے تو ---؟" نئی نویلی دلھن تین دن میں قدرے بے تکلف ہو چلی تھی۔

"تو میں تمھارے لئے دُنیا کے حسین ترین الفاظ چُن کر تخیّلات کا ایک خوابناک محل تعمیر کرتا اور...... اور نہ معلوم کیا کیا کرتا...... لیکن......"

"لیکن ------؟" نوعروس کا تجسس بیدار ہو چکا تھا۔

"لیکن افسوس تو یہی ہے امبرا کہ میں نہ تو اتنا دولتمند ہی ہوں کہ تمہارے قدموں پہ سونے چاندی کے ڈھیر لگا سکوں نہ شاعر ہوں کہ تمھارا دامن چاند ستاروں سے بھر دوں۔ میں تو ایک معمولی سائنس مین ہوں جو اپنے جذبات کا مناسب اظہار کرنے پر قدرت بھی نہیں رکھتا۔"

"اور میرے لئے ....؟" امبر نے لجاتے ہوئے کہا۔ "یہی معمولی سائنس مین دنیا کا سب سے زیادہ دولتمند آدمی اور سب سے بڑا شاعر ہے۔"

وہ دونوں کافی دیر تک خاموش رہ کر ایک دوسرے کی گرم گرم سانسیں محسوس کرتے رہے

"آج آپ کچھ پریشان سے ہیں۔" امبر نے سکوت قطع کیا۔

"پریشان تو کیا ——" وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "البتہ مجھے یہ احساس چُبھ رہا ہے کہ آج تین دِن ہماری شادی کو ہوئے۔ میں اس قلیل سی مدّت میں ہی تمہیں اتنی شِدّت سے پیار کرنے لگا ہوں جیسے ہمارا جنم جنم کا ساتھ ہو لیکن اس بے پناہ محبّت کے باوجود جو مجھے تم سے ہے، میں سوائے دِل کے اور کوئی حقیر سا تحفہ بھی تمہاری نذر نہ کر سکا۔"

"محبت تحفوں کی مرہونِ منّت نہیں ہوتی سوامی!" امبر نے پیلو بھری باہیں اس کے گلے میں حمائل کر دیں۔ وہ مُسکرا دیا۔

"میں جو اس وقت اپنی محبت کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں تلاش کر پا رہا ہوں امبر! وہی میں۔ کبھی زمانے میں محبت کو مانتا ہی نہ تھا ——"

"جی ——؟" اس نے ایسی سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا جیسے کچھ سمجھی ہی نہ ہو۔

"ہاں امبر! شادی سے قبل میں کبھی محبّت کا قائل نہیں رہا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ چاندی کی سی گھنٹیاں بجاتی ہوئی وہ معصوم ہنسی اُسے بے حد پیاری لگی۔ اُس نے اس کے چہرے پر زُلفیں بکھیر دیں اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا ——

"تمہیں یقین نہیں آیا —— شاید تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اپنے آپ کو تمہارے سامنے پاکباز ظاہر کرنے کے لئے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ لیکن یہ سچ ہے امبر! تمہارے دیوتے کمار میں دُنیا کی ہزاروں بُرائیاں ہیں لیکن تجربہ تمہارے سامنے ثابت کر دے گا کہ اس میں ایک خوبی یہ ضرور ہے کہ وہ بے حد صاف گو ہے۔ لیکن ہٹاؤ —— میں یہ کہاں کی باتیں لے بیٹھا۔ نئی نویلی دُلہن کے سامنے تو مجھے صرف پیار و محبّت کی باتیں کرنی چاہئیں۔"

"جی نہیں ——" وہ اُس سے جھول سی گئی —— "آپ کی باتیں مجھے بے حد اچھی لگ رہی ہیں۔ بتائیے نا —— آپ یہ کیا کہہ رہے تھے۔"

"میں کہنا چاہتا تھا" وہ کھویا کھویا سا کہتا رہا۔ "کہ میں نے زندگی میں تم سے پہلی بار حقیقی معنوں میں محبت کی ہے ورنہ اس سے پہلے تو محبت کے مفہوم تک سے ناآشنا تھا۔ جب لوگ محبت کے افسانے میرے سامنے دہراتے تھے تو مجھے بے حد ہنسی آتی تھی۔ لیلیٰ مجنوں۔ سونی مہیوال اور رومیو جولیٹ کے قصے مجھے کبھی متاثر نہیں کر سکے۔ محبت، میرے نزدیک محض ایک جنس کی جنس مخالف میں مدغم ہو جانے کی خواہش کا نام تھا۔۔۔ یعنی ایک قطعی جنسی بھوک اور پیاس قسم کی چیز۔۔۔ مجھے حیرت ہوتی تھی جب لوگ محبت کے تانے بانے روحانیت سے ملاتے تھے۔ لیکن اب، شادی کے بعد، جبکہ مجھے تمہارے ساتھ جنسی قربت کے تمام مواقع قانوناً بھی حاصل ہیں، میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ اگر یہ مواقع مجھے نہ بھی حاصل ہوتے یا کوئی اور مجبوری مجھے اس سے محروم کر دیتی۔ تب بھی میں دل کی اتنی ہی گہرائیوں کے ساتھ تم سے پیار کرتا۔۔۔"

"تو آپ کی زندگی میں میرے علاوہ کوئی اور لڑکی .... میرا مطلب ہے نوجوان لڑکی نہیں داخل ہوئی؟" امبر نے بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال میری صاف گوئی کو چیلنج کرتا ہے۔۔۔" اس نے جواب دیا۔۔۔ "لیکن میں یہاں بھی تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ بیوی سے، خصوصاً جب وہ نئی نئی تمہاری زندگی میں داخل ہوئی ہو، اس قسم کی باتیں احمقانہ ہی کہی جائیں گی لیکن اچھا ہے کہ حقیقت تم سے چھپی نہ رہے۔ بہتر یہی ہے کہ کل جو باتیں تمہیں دوسروں سے معلوم ہونی ہیں وہ میں آج خود ہی تم سے بتلا دوں۔ دراصل میں بہت ہی بُرے چال چلن کا آدمی رہا ہوں امبر! میری سابقہ زندگی میں کم از کم سترہ لڑکیاں ایسی داخل ہوئیں۔ جن سے میں نے جنسی تعلقات قائم کئے۔"

"جی۔۔۔؟ سترہ لڑکیاں! امبر نے چونک کر پوچھا۔۔۔۔۔۔"

"ہاں۔ آج خود ہی تم سے بتلا دوں۔ دراصل میں بہت ہی بُرے چال چلن کا آدمی رہا ہوں امبر! میری سابقہ زندگی میں کم از کم سترہ لڑکیاں ایسی داخل ہوئیں۔ جن سے میں نے جنسی تعلقات قائم کئے۔۔۔"

اُس نے جھانک کر بیوی کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں معصومیت کے پیچھے صرف حیرت مُسکرا رہی تھی۔ کہیں بھی رشک و حسد یا بدگمانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ کافی دیر تک اُن آنکھوں کی جھیل میں ڈوبا رہا۔

"یہ آپ میری آنکھوں میں کیا تلاش کر رہے ہیں ؟"

"یہ کہ تمہیں میری بات پر صرف حیرت ہی ہوئی ہے۔ کسی قسم کی جلن یا بدگمانی تو نہیں پیدا ہوئی۔ تمہارے دِل میں ؟" اُس نے پوچھا۔

شربتی ہنسی نے ایک بار پھر نقرئی گھنٹیاں سی بجائیں ——

"جلن — بدگمانی — ؟ یہ سب کس لئے ؟ کوئی آدمی زندگی میں سترہ بار محبت کر ہی نہیں سکتا۔ اور اگر بالفرض آپ نے کی بھی ہے تو بھی اس میں میرے لئے جلنے یا بدگمان ہونے کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ اب تو آپ صرف مُجھی سے محبت کرتے ہیں ——"

"تم میری بات سمجھی نہیں ڈارلنگ !" اس نے امبر کا بازو سہلاتے ہوئے کہا — "یہی تو میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ سترہ لڑکیوں سے میرا جنسی تعلق رہا۔ اُن میں سے ایک بے چاری تو خاصی بدنام بھی ہوئی لیکن سچ مانو میں نے کبھی اُن سے محبت نہیں کی۔ اس قسم کا کوئی جذبہ ہی نہیں پیدا ہوا میرے دِل میں۔ وہ تو میرے جسم کو جنس مخالف کے جسم کی ضرورت تھی اور بس !"

"توبہ ——!" امبر نے مُسکرا کر اُسے چھیڑنے کی غرض سے کہا — "آپ بھی بڑے وہ ہیں۔ کیا زندگی میں جتنی بھی لڑکیاں آپ کے پاس آئیں آپ نے کسی کو نہیں بخشا — ؟"

"مجھے اب اپنی ان حرکتوں پر بے حد ندامت ہے لیکن تمہارا خیال تقریباً صحیح ہے —"

"یہ تقریباً کیسی — ؟"

"ایک اٹھارویں لڑکی اور بھی تھی ——"

"اٹھارویں —— ؟!"

"ہاں اٹھارویں ——" اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ "تارا نام تھا اُس کا۔
وہ اٹھارویں لڑکی تھی میری زندگی میں داخل ہونے والی۔ لیکن چونکہ سترھویں لڑکی کے
ساتھ میرے تعلقات ایک ناجائز بچّے کی شکل میں سامنے آئے تھے اور اس کا جو حشر ہوا تھا۔
وہ میرے دل پر نقش تھا اس لئے میں نے تارا کے جسم سے کبھی کوئی استفادہ نہیں حاصل کیا۔"

"موقعہ ہی نہ ملا ہوگا آپ کو ورنہ آپ کب چھوڑنے والے تھے ——!" امبر نے
اُسے پھر چھیڑا۔

"نہیں —— یہ بات تو نہ تھی۔" وہ کہتا گیا —— "مواقع سیکڑوں ملے، لیکن میں دودھ
کا جلا ہوا تھا۔ لہٰذا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا رہا اور میری ان محتاط اداؤں پر تارا کو
اکثر یہ گمان گزرتا رہا کہ میں اس سے سچّی محبّت کرتا ہوں۔ حالانکہ اس وقت تک میں محبت کا
قائل ہی نہ تھا۔ وہ تو صرف زندگی کی کڑی دھوپ سے نجات پانے کے لئے جنس لطیف کے
آنچل کا خنک سایہ حاصل کرنے کی بات تھی۔ محض ایک وقتی تفریح ——"

"کتنے دن ہوگئے اِس سے بچھڑے ہوئے آپ کو؟"

"غالباً پانچ سال سے اوپر ——"

"اب پتہ نہیں کہاں ہے بیچاری؟"

"کانپور میں ——" اس نے بیوی کو اپنے قریب کھینچتے ہوئے جواب دیا ——

"تمہیں بڑا مزہ آرہا ہے ان باتوں میں —— ؟"

"جی ہاں ——" وہ شرماتے ہوئے بولی —— "زندگی میں پہلی بار اس موضوع
پر اتنی عجیب باتیں سُن رہی ہوں۔ کافی دِل چسپ معلوم ہو رہی ہیں —— ہاں تو پھر بتلایا
نہیں آپ نے کہ وہ کہاں ہے؟"

"کہاں ہیں نا ہے کہ کانپور ہیں ——— ابھی پچھلے دِنوں ہی تو اپنی شادی کے موقعہ پر اُس کا مبارکباد کا خط آیا تھا۔ تین سال قبل اس کی شادی ایک اچھی جگہ ہو رہی تھی۔ لیکن اُس نے لڑکے والوں کو اپنی فرضی سہیلی کے نام سے خود ہی خط لکھ کر میرے اور اپنے تعلقات کا راز افشاء کر دیا اور پھر واقعہ کو اتنی شہرت دی کہ کہیں اور شادی کی بات چلنے کا سوال ہی باقی نہیں رہ گیا۔ میں نے اُسے صاف صاف سمجھا دیا تھا کہ میں نہ اُس سے محبت کرتا ہوں نہ اس کے ساتھ شادی کرنے پر ہی رضامند ہوں کیونکہ میں ایک راجپوت کی اولاد ہوں اور وہ بنئے کی بیٹی!"

"اب کیا کرتی ہے وہ ——؟ ماں باپ کے پاس ہوگی؟"

"پہلے ہی یتیم تھی وہ ..... ؟ اور ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ اس واقعہ کے بعد ملازمت بھی جاتی رہی۔ آج کل ٹی۔ بی اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ لکھا تھا خرچ کی طرف سے بے حد پریشان ہے۔"

"بڑے نردئی ہیں آپ ——" امبر نے آنکھ میں آنسو لا کر کہا —— "اگر محبت نہیں تھی تو کیا ——— آخر انسانی ہمدردی بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ اُسے صبح ہی ۱۰۰ روپے منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ روپے میں دوں گی۔ ماتا جی نے کچھ نقد روپیہ مجھے چلتے ہوئے دیا تھا وہ میرے کس کام آئے گا۔ ساتھ میں میرا نمستے بھی لکھ دیجئے گا۔ واہ! مجھے آپ کی یہ کٹھورتا واقعی بُری لگی۔"

دوسرے دن صبح دس بجے کمار نے ۱۰۰ روپے کا منی آرڈر تارا کے نام کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد وہ امبر کو پہلے سے ہزار گُنا زیادہ چاہنے لگا۔ جو لڑکی اتنی خوبصورت ہو۔ اور سینے میں اُتنا ہی خوبصورت دِل بھی رکھتی ہو اُسے جتنا بھی چاہا جائے کم ہے۔

لیکن ساتویں دِن جب وہ دوکان بند کر کے گھر واپس لوٹا تو اس نے دیکھا امبر میز کے کنارے کرسی پر منہ لٹکائے بیٹھی ہے اور میز پر تارا کا خط پڑا ہوا ہے ———

"مجھے کبھی آپ کے روپیوں کی ضرورت نہ تھی اس لئے واپس بھیج رہی ہوں۔

میرے لئے صرف آپکی محبت کافی ہے ——— "تارا"

اُس نے امبر کی ٹھوڑی پکڑ کر اُس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا ——

"تو جانِ من! اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے؟ ہم نے اپنا اخلاقی فرض پورا کر دیا۔ وہ کافی ضدی لڑکی ہے۔ تمہیں جی چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں ——"

امبر کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ———

"وہ .... وہ آپ کو چاہتی ہے ——"

"یہ تو میں تمہیں پہلے ہی بتلا چکا ہوں ——" اُس نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "لیکن اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔

اور ——؟ میں تو اُسے نہیں چاہتا۔"

امبر نے مختلف جذبات سے نم آنکھوں کے ساتھ بڑی دیر تک اُسے دیکھا اور پھر اُس کے شانے پر سر رکھ کر زور زور سے رونے لگی ———

"مجھے ...... مجھے یقین نہیں آتا کہ ..... کہ" اُس کی آواز تیری طرح کپکپا رہی تھی ———

"کہ آپ ...... آپ ......"

اور وجے کمار نے محبت کی طرح پہلی بار اس حقیقت کو سمجھا کہ بہت سے جذبات بے نام بھی ہوتے ہیں۔

(اگست سنہ ۱۹۴۰ء)

کالا آٹا

"پاپا اِلوتی نئی.... آتا تم....!"

بڑے لوگوں کے سکریٹری شارٹ ہینڈ میں لکھتے ہیں۔ ہمارا تین سالہ بچہ فیروز شارٹ ہینڈ میں بولتا ہے۔ چنانچہ میں سمجھ گیا کہ اُس نے روٹی نہ ملنے کی وجہ آٹے کا ختم ہونا بیان کی ہے۔ کلرک آدمی کے لئے مہینے کے بالکل ہی ابتدائی دور میں اس قسم کے جملے ذرا ناقابلِ برداشت ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں نے اُسے ہاتھ سے ایک طرف ڈھکیل دیا اور چشمہ اُتار کر احتیاط سے ٹیبل پر رکھا کہ اُسے پھینکنے میں ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔

"عفت" میری بیوی باورچی خانے میں برتن بجا رہی تھی۔ میں نے اس سے غرّا کر پوچھا۔

"کیوں کھانے میں اور کتنی دیر لگے گی!"—

"وہ بدستور برتن مانجھتی رہی۔

"عجیب عادت ہے تمہاری" میں نے دفتر کی بھڑاس اُس پر نکالنی چاہی۔ "جانتی ہو ساڑھے نو بجے کا گیا ہوں اور اس وقت لوٹا ہوں دفتر سے ایک پیالی چائے تک

نصیب نہیں ہوتی اور کم ہو کہ وقت پر ......"

"کھانا تک نہیں تیار کر سکتیں ۔" اس نے میرا جملہ پورا کر دیا اور برتن ادھورے چھوڑ کر اُٹھ آئی ۔" میں نے صبح ہی بتلا دیا تھا کہ ......"

"آٹا ختم ہو گیا ہے۔" اس بار میں نے اُس کا جملہ پورا کر دیا۔

وہ ہنسنے لگی۔

"اچھا اب ہنسی کا کنٹرول کر کے بتاؤ" میں نے اپنا بگڑا ہوا موڈ سنبھالنے کی کوشش کی "کہ آٹا منگوایا کیوں نہیں؟"

"اشفاق بیچارہ تین دن سے تو دوڑ رہا ہے" اس نے جواب دیا "پرسوں سے روزانہ دوپہر کے بعد اسکول سے چھٹی لے کر آ جاتا ہے اور آٹا لانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ آج بھی وہیں گیا ہوا ہے۔ ——"

"تو پھر سرکاری غلّے کی دوکان سے گیہوں کیوں نہیں منگوا لئے صرف پسنے اور پیلنے ہی کی تو زحمت ہوتی ——"

"وہاں گیہوں ختم ہو گئے —— دوکان چار دن سے بند ہے!"

"بازار سے منگوا لیتیں؟"

"بازار بھاؤ چالیس روپیہ من کا ہے۔ ڈیڑھ سو روپے میں مہینہ بھی تو چلانا ہے" "یعنی بھوکے رہ رہ کر؟"

"اوہ!" اُس نے مجھے مُنہ چڑاتے ہوئے کہا ۔" شاید بھوک بہت زور کی لگی ہے۔ سالن وغیرہ سب تیار ہے۔ اشفاق آٹا لے کر آتا ہی ہو گا۔ تب تک آپ ذرا سا ہنس لیجئے۔"

میں تعمیلِ حکم کے طور پر ہنسنے لگا۔

لیکن تھوڑی دیر بعد اشفاق بے نیل و مرام واپس آیا تو میرے تن بدن میں

آگ ہی لگ گئی۔

"کیوں ۔۔؟ آٹا آج بھی نہیں ملا؟"

"وہ بچوں کو نہیں دیتے۔"

"پاپا!" فیروزہ نے بیچ میں لقمہ دیا۔ "آٹا بچّی نہیں۔۔۔!"

"آپ اپنے ہونٹوں کے پھاٹک فی الحال بند کیجئے۔" میں نے اُس کے گال پر تھپکی دی۔ "اشفاق تم میرے ساتھ آؤ۔"

جب میں لگا کر چلنے کو ہوا تو بیوی پوچھ بیٹھی۔

"کہاں جائیے گا؟"

"آٹے والے کے پاس۔"

"لیکن اب تو وقت ختم ہو گیا۔" اشفاق نے کہا۔ "شام کو چار سے چھ بجے تک ملتا ہے۔"

"تم آؤ تو ۔۔۔" میں جھلا کر بولا۔

بیوی نے کہا ۔۔۔ "دیکھئے لڑ نہ بیٹھئے گا کسی سے۔ اس وقت آپ کا مزاج عام طور پر چڑچڑا رہتا ہے۔"

"تم نصرٌ من اللہ کا وظیفہ پڑھو، میں ابھی آتا ہوں۔"

لپکتا ہوا سرکاری آٹے کی دوکان پر پہنچا۔ کچھ لوگ ڈھائی ڈھائی کلو کی آٹے کی تھیلیاں لئے ہوئے اطمینان سے دوکان سے نکل رہے تھے حالانکہ ساڑھے چھ بج چکے تھے دوکان میں داخل ہوا تو گدّی پر سیٹھ جی دو منیموں کے ساتھ براجمان تھے اور مونڈھے پر ایک ہیڈ کانسٹیبل صاحب تشریف فرما تھے۔

"۔۔۔ ہاں تو وہ کل کا بقایہ رہ ہی گیا" ہیڈ صاحب کہہ رہے تھے۔

ادھر سے میں حاضر ہو گیا ۔۔۔

"کیوں صاحب؟ یہ کیا دھاندلی ہے؟"

"ذرا ایک منٹ ـــ" سیٹھ جی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور سامنے پڑے ہوئے نوٹوں کے انبار سے پانچ کا نوٹ نکال کر ہیڈ صاحب کو تھماتے ہوئے بولے۔

"باقی حساب کل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک!" ہیڈ صاحب نے احتیاط سے تہہ کر کے نوٹ جیب کے حوالے کیا اور رخصت ہوئے۔

"جی ـــ! اب فرمایئے۔" سیٹھ جی مجھ سے مخاطب ہوئے

"کہنا کیا ہے؟" میں غرا کر بولا۔" میں محکمہ جنگلات میں ملازم ہوں۔ صبح ساڑھے نو بجے دفتر جاتا ہوں اور ساڑھے پانچ چھ بجے واپس آتا ہوں۔۔۔"

"یہ سچ ـــ سچ ـــ" سیٹھ جی نے ہمدردی کا اظہار فرمایا۔" بڑی محنت کرتے ہیں آپ۔ لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"ـــ آپ آٹا دے سکتے ہیں مجھے ـــ یہ میرا بھانجہ ہے اشفاق۔ تین دن سے واپس لوٹ رہا ہے۔ تین فرلانگ لمبی لائن میں آکر تین بجے سے لگتا ہے اور جب اس کا نمبر آتا ہے تو آپ کے ہاں سے جواب ملتا ہے کہ بچوں کو آٹا نہیں ملے گا۔"

"صاحب! وہ تو قانون ہی ایسا ہے ـــ!"

"یہ پانچ فٹ کا لڑکا آپ کو بچہ نظر آتا ہے! نویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ سولھویں سال میں ہے۔ پھر ایسا کوئی قانون نہیں ہے۔ ظاہر ہے میں سرکاری ملازمت میں ہوں۔ صرف بارہ دن کی رخصت اتفاقیہ مجھے سال بھر میں ملتی ہے۔ روزانہ چار سے چھ بجے کے درمیان دفتر سے رخصت لے کر آٹا خریدنے آپ کی دوکان پر آنے سے رہا۔ میرا بچہ یا بھانجہ آتا ہے، آپ کو دینا چاہیئے۔"

وہ بولے ـــ

"دیکھئے آٹا دراصل ہماری دوکان پر مِل والے براہِ راست آکر فروخت کرتے ہیں۔ ہمیں تو صرف چند فیصدی کمیشن بھر ملتا ہے۔ وہ لوگ شروع میں بچے بوڑھے سب کو دیتے تھے۔ اب قانون بنادیا ہے کہ بچوں کو نہیں دیں گے۔"

"کس نے یہ قانون بنادیا ہے؟ سرکار نے؟"

"جی نہیں — مِل والوں نے!"

"بہت خوب!" میں نے مُنہ بنا کر کہا — "وہ قانون بنانے والے کون ہوتے ہیں؟"

"بچے آٹا پھینک دیں، پیسے گم کردیں، راستے ہی میں کھاجائیں یا ویسی ہی کوئی اور گڑبڑ نہ کریں۔ اس لئے انھوں نے یہ قاعدہ بنادیا —"

"یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ میرے ہاں کوئی لانے والا نہیں ہے، میں ہوں تو دفتر میں رہتا ہوں۔ ہمیں آٹا کون لاکر دے گا۔ اسے بھی اسکول سے چھٹی لے کر آنا پڑتا ہے۔"

"عورتیں آکر لے جائیں —!"

میں جھنجھلا گیا —

"سیٹھ جی! دراصل ہم جاہلوں کے گھروں میں پردہ ہوتا ہے۔ عورتیں نہیں آسکتیں۔ بالفرض آئیں تو دو ڈھائی کلو آٹے کے لئے دو روپے تانگے والے کو دینا پڑیں۔ پھر گھر کا کام کاج کون کرے گا۔ بچوں کو کون سنبھالے گا۔ آپ کے ہاں تو یہ لمبی لائن لگتی ہے —"

"تب پھر مجبوری ہے —"

"مجبوری —؟ آپ اس بچے کو آٹا دیا کیجئے —"

"اچھی بات ہے —" سیٹھ جی نے لہجے میں کچھ لچک پیدا کی — "آج تو دکان بند ہوچکی ہے۔ کل دیدیں گے۔"

"اور پرسوں بھی ـــ" میں نے ہمیشہ کی جھنجھٹ ہٹانی چاہی۔

"جی ہاں اگر آپ آکر کہہ گئے تو اس دن بھی دے دیں گے۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔"

"صاحب! آپ تو بحث کرنے لگے۔ مجھے دوسرے کام بھی دیکھنے ہیں نمستے!"
سیٹھ جی نے کہا اور گردن جھکا کر نوٹ جمانے لگے۔ بڑے نوٹ الگ۔ چھوٹے نوٹ الگ۔

"چلو اشفاق!"

میں وہاں سے نکل کر سیدھا قریبی تھانے میں پہنچا لیکن وہاں معلوم ہوا کہ جس حلقے کی وہ دوکان ہے اس سے متعلقہ تھانہ دوسرا ہے جو وہاں سے کم از کم ایک میل کی دوری پر تھا۔ مزید چل سکنے کی تاب نہ تھی۔ چنانچہ تانگہ کیا اور متعلقہ تھانے میں پہنچا۔ تھانیدار صاحب کسی عورت کا بیان لینے میں مصروف تھے۔ میرا نمبر آنے تک آٹھ بج گئے بہرحال میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو بولے۔

"فرمائیے ـــ آپ کی تعریف؟"

میں نے انہیں اپنا نام بتایا اور یہ بتلانا بھی نہ بھولا کہ افسانہ نگار اور شاعر بھی ہوں لیکن وہ مرعوب ہونے کی بجائے بھڑک گئے ـــ

"آپ کرتے کیا ہیں؟ اور یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"میں کلرک ہوں فارسٹ ڈپارٹمنٹ میں!"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔ بیٹھ جائیے۔"

میں نے سوچا ابتدا اچھی ہوئی ہے چنانچہ مناسب پہلو سے بیٹھ کر بڑے رقت آمیز لہجے میں اپنا بیان شروع کیا ـــ

"انسپکٹر صاحب! میں ملازم آدمی ہوں۔ صبح کا گیا چھ بجے تک دفتر سے لوٹتا ہوں۔ خود سودا سلف خریدنے نہیں جا سکتا۔ محلے کی سرکاری غلے کی دوکان۔۔۔

چار دن سے بند ہے کہ اسٹاک ختم ہو گیا۔ شہر میں سرکاری آٹے کی صرف دو دو دکانیں ہیں وہاں ایک دن میں صرف ڈھائی کو آٹا ملتا ہے۔ میرے گھر میں پانچ نفر کھانے والے ہیں ایک دن میں آٹا ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ساتھ ملے تو ایک دن کی رخصت لے کر کچا خرید کر رکھ دوں۔ روز روز تو رخصت ملنے سے رہی۔ یہ میرا بھانجہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ نویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ تین دن سے اسکول سے چھٹی لے کر آٹے کی دکان پر لائن میں لگتا ہے۔ لیکن دکان دار اُسے آٹا نہیں دیتے کہ بچوں کو نہیں ملیگا۔"

"کبھی کبھی پولیس والے بھی بیچ ہی میں لائن سے نکال دیتے ہیں" اشفاق نے بیچ میں کہا۔

"کیا مطلب — ؟" تھانیدار صاحب نے تیوریاں بدلیں۔

"جی ہاں صاحب!" اشفاق نے جواب دیا — "پولیس والے بھی کبھی کبھی بیچ میں لائن سے نکال دیتے ہیں۔"

"کیوں نکال دیتے ہیں جی؟"

"کہتے ہیں بچوں کو آٹا نہیں ملتا —"

"نہیں — نہیں —" داروغہ جی نے میز پر گھونسہ مارا — "پولیس والے ایسی خلافِ قانون بات نہیں کہہ سکتے۔ تم لائن میں اپنے نمبر سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہو گے۔"

"یہ بات نہیں ہے انسپکٹر صاحب!" میں نے انہیں سمجھانا چاہا — "دکاندار صرف بچوں کو آٹا نہ دینے کی بات کرتا ہے میں ابھی ابھی اُس سے مل کر آرہا ہوں۔ وہیں میں نے آپ کے ہیڈ کانسٹبل کو سیٹھ جی سے روپے وصول کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے!"

"کیسے روپے —— ؟"

"بچوں کو لائن سے نکال دینے کا معاوضہ!"

"کیوں —— ؟"

" تاکہ وہی آٹا بلیک میں فروخت کیا جا سکے "

تھانیدار صاحب ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے ـــــ

" آپ میرا وقت ضائع نہ کیجئے ـــــ فوراً تھانے سے باہر نکل جایئے۔ اگر آپ سرکاری ملازم نہ ہوتے تو میں ...."

" لیکن تھانیدار صاحب! ہم تین دن سے چاول کھاتے کھاتے تنگ آ گئے ہیں۔ اول تو زکام اور نزلہ پیدا کرتے ہیں دوسرے مہنگے بھی اتنے ...."

" آپ جاتے ہیں یا نہیں ....؟"

میں لپک کر تھانے سے باہر آ گیا۔ پہلے سوچا کسی سیاسی لیڈر کے پاس جاؤں۔ پھر خیال آیا ملازم سرکار ہوں۔ ایک بار ارادہ کیا کہ چیف منسٹر کے بنگلے پر پہنچوں۔ لیکن ایسے چھوٹے آدمی ہونے کا احساس ہوا۔ چنانچہ اشفاق کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی فیروز نے سٹارٹ ہینڈ شروع کر دی ـــــ

" پاپا! آٹا بوت ...... اتی لوتی ایں ......" (پاپا آٹا بہت سا آ گیا ہے امّی نے روٹیاں پکائی ہیں)

" لیجئے آپ تو پھر خالی ہاتھ آ گئے اور ہم نے آٹا منگوا بھی لیا ـــ" عقو نے آنکھیں گھما کر فاخرانہ انداز میں ارشاد فرمایا۔

" کہاں سے؟"

" پڑوسن کا بچہ چکی پر سے لایا ہے۔"

" کتنا ـــــ؟"

" دس کلو ـــــ بارہ روپے کا"

مجھے چکر سے آ رہے تھے، صبح سے اس وقت تک کولھو کے بیل کی طرح جتے رہنے کے بعد بے حد تکان محسوس کر رہا تھا۔ پھر بھی لپک کر آٹے کے کنستر میں جھانکنے لگا

جو لبالب کسی سیاہ رنگ کے سفوف سے بھرا ہوا تھا۔ ہاتھ ڈال کر دیکھا۔۔۔ تو وہ کالا کالا سفوف تمام ہاتھ میں لتھڑ گیا۔ میں جلدی سے سر تھام کر تخت پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔۔۔۔۔۔

"بیگم یہ آٹا اِتنا کالا کیوں ہے ؟!!"

(ستمبر ۱۹۶۴ء)

طمانچہ

ایک ریڈیائی تمثیل

(پختہ فرش پر قدموں کی چاپ بتدریج قریب آتی جائے)

سلیم ــــ "سلمیٰ!"

(قدموں کی چاپ واضح ہو جائے۔ بستر تھپتھپانے کی آوازیں)

سلیم ــــ "سلمیٰ ــــ!" (قدرے زور سے) "ارے بھئی سلمیٰ!"

سلمیٰ ــــ (دور سے آواز آتی ہے) "ــــ جی!"

(بستر جھٹکنے کی آواز)

سلیم ــــ (پریشانی کے عالم میں) "میری الماریوں کی چابیاں کہاں ہیں؟"

سلمیٰ ــــ (دوسرے کمرے سے) "وہیں مسہری پر ہوں گی۔"

سلیم ــــ (قدرے جھنجھلاہٹ کے ساتھ) ــــ "عورتوں کی عادتیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ چابیاں بستر میں چھپا کر رکھتی ہیں۔"

(اِدھر اُدھر زور زور سے ہاتھ مارتا ہے۔ کھڑکھڑاہٹ کی آواز)

سلیم ــــ (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) ــــ "اور اس تکیے میں نہیں معلوم کیا ٹھونس

رکھا ہے ——" (وقفہ)

(کھڑکھڑاہٹ اور کاغذات کی سرسراہٹ)

سلیم —— (تعجب کے ساتھ) ——" ارے! یہ تو کسی نوجوان کی تصویر ہے۔ اور یہ اس کی پشت پر کیا لکھا ہوا ہے؟"

(دبی دبی آواز میں رُک رُک کر پڑھتا ہے)

سلیم —— (ایک سرد آہ کے ساتھ لرزتی ہوئی آواز میں) ۔" جان سے پیاری سلمیٰ! تمہاری شادی پر کیا تحفہ نذر کروں؟ ایک دِل تھا جو پہلے ہی بھینٹ چڑھا چکا ہوں۔ اپنی ایک تصویر بھیج رہا ہوں۔ اسے دیکھ کر کبھی کبھی تمہارے دِل میں اس نامراد کی یاد تازہ ہو جایا کرے گی جو تم پر دیوانہ وار مرتا ہے۔ تمہارا اپنا۔ بدنصیب۔ شابی!"

(فرش پر قدموں کی وزنی آوازیں، وقفہ، سرد آہیں)

سلمیٰ —— (دُور سے —— لیکن آواز بتدریج قریب آتی جائے) "میں نے کہا چابیاں تو ادھر میز پر پڑی ہیں"

سلیم —— (بہت تیز قدموں کے ساتھ) " وہ آرہی ہے۔ اس تصویر کو پھر بکسے میں رکھ دینا چاہیئے۔"

سلمیٰ —— (قریب سے) " یہ لیجئے اپنی چابیاں —— خود ہی میز پر ڈال رکھی ہیں اور ادھر ادھر ڈھونڈھتے پھر رہے ہیں "

(فرش پر وزنی قدموں کی مسلسل چاپ)

سلمیٰ —— " ارے آپ اتنے پریشان سے کیوں ہیں؟ آفس کو تو ابھی کوئی خاص دیر نہیں ہوئی۔"

سلیم —— (ٹھنڈی سانس بھر کر) " سلمیٰ!"

سلمیٰ ——— "جی !"

سلیم ——— "کچھ نہیں ———"

سلمیٰ ——— "خدا خیر کرے۔ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں "

سلیم ——— (گھبرائی ہوئی آواز میں) "کچھ نہیں سلمیٰ۔ کچھ نہیں۔ دراصل میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ......"

سلمیٰ ——— "اے اللہ! میں کہتی ہوں اب پوچھ بھی چکئے "

سلیم ——— (کھنکار کر) "میں پوچھنا چاہتا تھا کہ شام کو پکچر دیکھنے چل رہی ہو نا ؟"

سلمیٰ ——— (کھلکھلا کر ہنستی ہے) "توبہ میری! میں تو ڈر گئی تھی کہ نہ جانے کیا بات ہے ؟"

سلیم ——— "کچھ نہیں ۔ اور کوئی خاص بات نہیں ۔"

(سلمیٰ پھر زور سے ہنستی ہے۔ ہنسی طویل ہوتی جاتی ہے اور کلائمکس پر پہنچ کر بتدریج مدھم ہوتے ہوئے ٹائپ مشین کی کھٹا کھٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ٹائپ مشین ہم آہنگی کے ساتھ مسلسل کھٹ پٹ کی آواز پیدا کر رہی ہے)

شہاب ——— (کھنکار کر) "آداب عرض ہے سلیم صاحب !"

(وقفہ۔ ٹائپ مشین مسلسل آواز پیدا کر رہی ہے)

شہاب ——— (قریب آ کر ذرا زور سے) "میں نے کہا سلیم صاحب! آداب عرض ہے"

(وقفہ۔ ٹائپ مشین مسلسل آواز پیدا کر رہی ہے) ——— تیز تیز جوتوں کی آوازیں)

شہاب ——— "ارے سلیم صاحب! یہ آج آپ کو ہو کیا گیا ہے ؟ میرے سلام کا جواب تک نہیں دیا۔" (ہنس کر مضحکہ اڑانے کے انداز میں) "بھئی واہ! رولر پر کاغذ تک نہیں چڑھایا اور اتنی محویت کے ساتھ ٹائپنگ ہو رہی ہے !"

(ٹائپ مشین رک جاتی ہے۔ کرسی سرکانے کی آواز)

سلیم ـــــ (چونک کر) "کون شہاب!"

شہاب ـــــ (طنزاً) "جی ہاں کب سے کھڑا ہوں۔ آپ اب جاگے ہیں!"

سلیم ـــــ "معاف کرنا بھئی! میں کچھ سوچ رہا تھا ـــــ تم ذرا میرے پاس بیٹھو"

(کرسی سرکانے کی آواز)

شہاب ـــــ "فرمائیے ـــــ آج آپ بہت پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔"

سلیم ـــــ "کچھ نہیں ـــــ ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ (وقفہ) ـــــ شہاب! ـــــ تم رہنے والے کہاں کے ہو؟"

شہاب ـــــ "جی لکھنؤ کا! ـــ بات کیا ہے؟"

سلیم ـــــ "کچھ نہیں ـــــ دراصل لکھنؤ میری سسرال ہے۔"

شہاب ـــــ "بہت خوب ـــــ آپ تو میرے ...."

(ہنسی کی آواز)

سلیم ـــــ "کیا تمھارا کوئی چھوٹا بھائی بھی ہے؟"

شہاب ـــــ "جی نہیں تو...... لیکن......"

سلیم ـــــ (رک رک کر) "اگر یہ تمھاری فرنچ کٹ داڑھی اور ریڈ نہ دیکھیں......"

شہاب ـــــ (پریشانی کے لہجے میں) "آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

سلیم ـــــ (چونک کر) "اوہ کچھ نہیں ـــــ کچھ بھی تو نہیں ـــــ دراصل میں یہ چاہتا تھا کہ شام کا کھانا تم میرے ساتھ کھاتے ـــ"

شہاب ـــــ (طویل ٹھنڈی سانس لیکر) "شکریہ! حاضر ہو جاؤں گا"

سلیم ـــــ "اب تم جا سکتے ہو اپنی میز پر"

(کاغذ سرسرانے کی آواز۔ مشین پھر چلنے لگتی ہے۔ کھٹ پٹ کی آوازیں واضح اور تیز ہو کر نقطۂ عروج کو پہنچ جاتی ہیں اور بتدریج مدھم ہوتے ہوئے

تحلیل ہو کر برتنوں کی کھنکھناہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہیں)

سلیم ۔۔۔ "بھئی تم تکلف کر رہے ہو" (آواز اسی طرح پھنسی پھنسی نکلے۔ جیسے بولنے والا اچھو کھا رہا ہو)

شہاب ۔۔۔ (منہ میں لقمہ پھنسا ہوا ہے) "یہ بھی آپ نے ایک ہی کہی۔ دیکھئے تو کتنی تیزی سے پلیٹیں صاف کی ہیں میں نے۔ البتہ آپ خود اپنے ہی گھر میں تکلف سے کام لے رہے ہیں۔"

(چمچوں کی کھنکھناہٹ اور برتن سرکانے کی آوازیں۔ طویل وقفہ)

سلیم ۔۔۔ "اپنے لئے چائے خود تیار کرو شہاب!" (قدرے بلند آواز میں) "سلمیٰ یہ برتن لے جاؤ۔"

شہاب ۔۔۔ (چونک کر لیکن آواز بہت مدھم ہے) "سلمیٰ!"

(دور سے سلمیٰ کی آواز آتی ہے)

سلمیٰ ۔۔۔ "جی! ابھی آئی۔"

(قدموں کی چاپ بتدریج قریب آتی ہے اور پھر ایک پیالہ زور دار چھناکے کے ساتھ ٹوٹتا ہے)

سلیم ۔۔۔ (طنز آلود لہجے میں) "کیوں شہاب؟ کیا بات ہے؟ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟"

شہاب ۔۔۔ (لرزتی ہوئی آواز میں) "جی ۔۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔۔"

سلمیٰ ۔۔۔ (حیرت کے ساتھ چیختی ہے) "شابی!"

(فرش پر کسی کے گرنے کا دھماکہ)

شہاب ۔۔۔ (ہکلاتے ہوئے) "صاحب! آپ بھابی کو سنبھالئے۔ میری ذرا طبیعت گڑبڑ ہے۔ چلتا ہوں۔"

(پختہ فرش پر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی آواز جو دُور کہیں جاکر تحلیل ہو جاتی ہے۔
وقفہ ۔ پھر بوجھل قدموں کی چاپ)

سلیم ـــــ "سلمیٰ!"

سلمیٰ ـــــ (بہت نحیف آواز میں) "جی!"

سلیم ـــــ "یہ پانی پی لو، طبیعت سنبھل جائے گی"

سلمیٰ ـــــ (چونک کر) "جی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یوں ہی ذرا سر چکرا گیا تھا"

سلیم ـــــ (بہت گمبھیر آواز میں) "گھبرانے کی کوئی بات نہیں سلمیٰ! مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ محبت کرنا کوئی گناہ نہیں ہے سلمیٰ۔ مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ تم نے مجھے اب تک اس راز سے بے خبر رکھا ورنہ میں اتنا ذلیل نہ تھا کہ تم دونوں کی محبت کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا۔ تم نے میرے خلوص کی توہین کی ہے۔ اس راز کو پوشیدہ رکھ کر سلمیٰ تم نے اس بے پناہ محبت کو ذلیل کیا ہے جو مجھے تم سے ہے......"

(سلمیٰ کے سسکنے کی آواز۔ ایک طویل ترین وقفہ)

سلمیٰ ـــــ (سسکتے ہوئے) "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" (رُک رُک کر) "یہ سچ ہے کہ مجھے شابی سے محبت تھی۔ لیکن اب قطعی نہیں ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آپ کی بے پناہ محبت نے اس کی یاد بھی میرے دل سے نکال پھینکی تھی۔ لیکن آج اُس نے یہاں آکر میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ میں کتنی خوش تھی اپنے اس چھوٹے سے پُرسکون گھر میں۔ آپ کی محبت پا کر میں خود کو دُنیا کی خوش نصیب ترین عورت سمجھتی تھی۔ شابی تم نے یہ کیا کیا؟ ـــــ یہ تم نے کیا کر دیا شابی!"

(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

سلیم ——— (اسی متین اور گھمبیر آواز میں) "اپنے آپ کو دھوکا دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔

سلمیٰ! میں جانتا ہوں کہ عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے اور

اس کی یاد کو عمر بھر کلیجے سے لگائے رکھتی ہے۔ میں نے تمھارے تکیئے میں تمہارے

کی تصویر صبح ہی دیکھ لی تھی۔ اُس نے آجکل ڈاڑھی بڑھا رکھی ہے۔ لیکن

پھر بھی میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ میرے ہی دفتر میں کلرک ہے۔ تمھیں فکر مند

ہونے کی ضرورت نہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

(سلمیٰ دیر تک زور زور سے سسکتی رہتی ہے اور پھر یہ سسکیاں کار کے

اسٹارٹ ہونے کی آواز میں دب جاتی ہیں)

سلیم ——— "سمجھ گئے نہ ڈرائیور؟"

ڈرائیور ——— "جی حضور!"

سلمیٰ ——— "لیکن میں نہیں جاؤں گی۔" (سسکتی ہے) "میں اُس کے پاس نہیں جاؤنگی

مجھے اپنے قدموں میں پڑی رہنے دیجئے۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

سلیم ——— (بہت جذباتی ہو کر) "نہیں سلمیٰ! یہ میری التجا ہے۔ تم اُس کے پاس جاؤ

میری نظروں میں تمھاری وہی عزت ہے جو پہلے تھی۔ میرے دل میں تمھارے

لئے وہی پُر خلوص محبت برقرار رہے گی جو روزِ اوّل سے ہے۔ لیکن میں دُنیا

کے سامنے ایثار کی ایک چھوٹی سی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سلمیٰ!

میرے اس جذبے کا خون نہ کرو سلمیٰ! ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔ خدا کی

قسم خودکشی کر لوں گا"

(سلمیٰ سسکتی رہتی ہے۔ کار کے انجن کی مسلسل گھڑگھڑاہٹ)

سلمیٰ ——— (سسکتے ہوئے) "اللہ! میں مر کیوں نہیں جاتی —— یہ آسمان کیوں نہیں

ٹوٹ پڑتا ہے؟"

سلیم ـــــ (بدستور اسی جذباتی لہجے میں) آواز فرطِ جذبات سے لرزتی ہوئی) "یوں بددل ہونے سے کوئی فائدہ نہیں سلمیٰ! میری بہترین تمنائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش و خرم اور شاداب رکھے۔ کل میرا اطلاع نامہ شہاب کے پاس پہنچ جائے گا اور پھر تم کچھ دنوں بعد اس کے ساتھ باعزت اور اچھی زندگی بسر کر سکو گی۔"

(وقفہ۔ کار کا انجن آواز پیدا کر رہا ہے۔ سلمیٰ بدستور سسکیاں بھر رہی ہے)

ڈرائیور ـــــ "تو میں لے جاؤں سرکار؟"

سلیم ـــــ "ہاں جاؤ! خدا حافظ!" (وقفہ) "اور ہاں سلمیٰ! اپنے شہاب سے کہنا کل آفس میں میرا استعفیٰ پہنچ جائے گا۔ میرے بعد وہی سب سے سینئر ہے اس لئے وہ آفس سپرنٹنڈنٹ ہو جائے گا ـــــ

اچھا ـــــ جاؤ ڈرائیور! خدا حافظ!"

(سلمیٰ پھپک پھپک کر رو دیتی ہے۔ کار چلنے کی آواز۔ سرد آہیں)

سلیم ـــــ "وہ چلی گئی!" (آواز بُری طرح بھرائی ہوئی ہے) "میں نے دو دلوں کو ملا دیا ـــــ

(سرد آہیں) کتنا عظیم ایثار کیا ہے میں نے ـــــ لیکن اب اس ٹوٹے ہوئے دل، اس بلکتی ہوئی محبت کو لے کر کہاں جاؤں ـــــ"

(بوجھل بوجھل قدموں کی ہم آہنگ آوازیں ـــــ ایک طویل وقفہ ـــــ پھر ایک کھٹکا ـــــ تھوڑی دیر تک ریڈیو کے گھڑگھڑانے کی آواز اور پھر یکلخت غمگین موسیقی کا فوارہ سا چھوٹ پڑے ـــــ مکیش کا ریکارڈ درمیان سا بجایا جائے)

ریڈیو ـــــ " (دھیرے دھیرے بج رہا ہے)

"دُنیا نے کئے وہ ہم پہ ستم جو پیار بھرے دل بل نہ سکے
کہنے کو بہار آئی تھی مگر دو پھول خوشی کے کھل نہ سکے
ارمانوں کا گلشن اُجڑ گیا، یہ یاد جوانی ہو گئی۔
لو ختم کہانی ہو گئی ....."

(اچانک ریڈیو بند ہو جاتا ہے۔ دروازے اور کھڑکیاں پر شور آواز کے ساتھ کھلنے اور بند ہونے کی خوفناک آوازیں ـــــ بادل گرجتا ہے۔ پانی گرنے کی صدائیں)

سلیم ـــــ (ایک بہت طویل سرد آہ بھر کر) "فیوز اُڑ گیا ـــ میری زندگی کا فیوز بھی اُڑ گیا۔ اب چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ ہولناک اندھیرا ـــــ آسمان بھی میری تباہی پہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے" (سرد آہیں)
"لیکن میری آنکھیں تو خشک ریگستان ہو کے رہ گئی ہیں۔ خدایا میں کدھر جاؤں ـــــ میں کدھر جاؤں خدایا!؟"

(سرد آہوں کے ساتھ بوجھل بوجھل قدموں کی آوازیں ـــ پس منظر میں پر شور بارش اور ہواؤں کے جھونکوں کی صدائیں ـــــ دروازے اور کھڑکیاں زور زور سے ٹکرا رہی ہیں)

ڈرائیور ـــــ (باہر سے دروازہ پیٹتے ہوئے) ـــــ "سرکار!"

(وقفہ)

ڈرائیور ـــــ (بہت زور سے دروازہ پیٹتا ہے) ـــ "سرکار! دروازہ کھولئے!"

(بوجھل بوجھل قدموں کی آواز۔ دروازہ پر شور چرچراہٹ کے ساتھ کھلے۔ اور ہواؤں کی سائیں سائیں ایک دم تیز ہو جائے)

سلیم ـــــ (گھبرائی ہوئی آواز میں) "چھوڑ آئے سلمیٰ کو؟"

ڈرائیور ـــــ (ہانپتے ہوئے) "غضب ہو گیا سرکار!"

سلیم —— (گھبرا کر) "کیوں —— ؟ کیا ہوا —— ؟"

ڈرائیور —— (زور زور سے ہانپتا ہے) "جی —— وہ —— جی —— وہ۔"

سلیم —— (چیخ کر) "جلدی کہو کمبخت —— ورنہ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا"

ڈرائیور —— "سرکار! وہ شہاب میاں سلمیٰ کو دیکھ کر بہت ناراض ہوئے۔ آپ کو بہت بُرا بھلا کہا۔ آپ کا خط پھاڑ کر پھینک دیا میرے منہ پر —— بی بی جی کو ایک طمانچہ بھی مارا اور کہا کہ ......"

سلیم —— (اُلجھن کے ساتھ) "کیا کہا —— اور کیا کہا اُس نے؟ جلدی بتاؤ ڈرائیور —— میں پاگل ہو رہا ہوں —— تمھارا گلا گھونٹ دوں گا ورنہ جلدی کہو ——"

ڈرائیور —— "کہہ تو رہا ہوں سرکار! انھوں نے کہا کہ سلیم کے بچے سے کہہ دینا کہ صرف وہی انسانیت اور ایثار کا ٹھیکیدار نہیں ہے۔ دُنیا میں دوسرے انسان بھی بستے ہیں"

سلیم —— "پھر ——؟"

ڈرائیور —— (سسکتے ہوئے) "پھر سرکار اُنھوں نے مجھے بُری طرح پیٹا۔ اور سلمیٰ بی بی کو اٹھا کر کار میں پھینک دیا اور بولے کہ دفعان ہو جاؤ یہاں سے —— اور یہ بھی کہا کہ وہ اس شہر سے ہی چلے جائیں گے"

سلیم —— (گھبرائی ہوئی جذباتی اور بہت نرم آواز میں) "شہاب تم عظیم ہو —— شہاب تم...."

ڈرائیور —— (متحیر ہو کر) "آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

سلیم —— (چونک کر) "ارے ہاں —— سلمیٰ کہاں ہے؟"

ڈرائیور —— "کار میں بے ہوش پڑی ہیں۔"

سلیم —— (زور سے) "کیا —— ؟ بے ہوش پڑی ہے وہ —— اور تو یہاں کھڑا باتیں بنا رہا ہے۔ نالائق کہیں کا —— جلدی سے دوڑ کر ڈاکٹر کو لا —— میں اُسے دیکھتا ہوں ——"

(ہلکی ہلکی بوندا باندی کی آواز —— پانی میں قدموں کے چھپاکے)

سلیم ——— (بہت پیار کے ساتھ) "سلمیٰ! ——— سلمیٰ میری جان!"

(وقفہ ——— پُرسکون موسیقی ——— پھر اچانک پسِ منظر سے پلیٹ فارم کی

آوازیں سر اُٹھائیں۔ "قلی قلی" "چائے گرم" "پان بیڑی سگرٹ" اور

پختہ فرش پر بے شمار قدموں کی بے ترتیب آوازیں)

شہاب ——— (سرد آہ کے ساتھ) "سلمیٰ!"

(پیسوں کی کھنکھناہٹ)

شہاب ——— "ایک ٹکٹ دیجئے۔"

بکنگ کلرک ——— "کہاں کا ٹکٹ؟"

شہاب ——— (سرد آہ بھر کر) "کہیں کا بھی دے دیجئے"

بکنگ کلرک ——— (حیران ہو کر) "جی کہاں کا؟"

شہاب ——— (طنز آلود ہنسی کے ساتھ) "یہ گاڑی کہاں تک جائے گی؟"

کلرک ——— (متحیرانہ لہجے میں) "ہوڑہ تک ——— لیکن آپ کو جانا کہاں ہے؟"

شہاب ——— (ہنس کر) "ہاوڑہ تک جاؤں گا ——— جلدی کیجئے۔ میں یہ شہر بہت جلد چھوڑ

دینا چاہتا ہوں ہمیشہ کے لئے ———"

(طویل وقفہ ——— پلیٹ فارم کی مخصوص آوازیں۔ انجنوں کی سیٹیاں ———

گاڑیوں کی آمد و رفت کا شور و غل اور پھر ایک پرشور سیٹی کی آواز کے بعد

صرف ایک۔ گاڑی کی ہم آہنگ کھٹ پٹ کے ساتھ ساتھ حزنیہ موسیقی اُبھرتی ہے

کھٹ پٹ کی آوازیں رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتی ہیں۔ اور حزنیہ موسیقی پورے تاثر کے

ساتھ اُبھر آتی ہے۔ شہاب نہایت ہی پُرسوز آواز میں گنگنا رہا ہے۔)

شہاب ———————————

"میرا جیون ساتھی بچھڑ گیا

لو ختم کہانی ہو گئی

لو ختم کہانی ہو گئی

دُنیا نے کئے وہ ہم پہ ستم

دو پیار بھرے دِل مِل نہ سکے

کہنے کو بہار آئی تھی مگر

دو پھول خوشی کے کھِل نہ سکے

ارمانوں کا گلشن اُجڑ گیا

برباد جوانی ہو گئی

لو ختم کہانی ہو گئی

لو ختم کہانی ہو گئی ——"

(آواز رفتہ رفتہ مدھم ہوتی جاتی ہے اور پس منظر سے المیہ موسیقی اُبھر کر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ ریل گاڑی کی کھٹ کھٹ مائک پر رینگ آتی ہے اور موسیقی کی لہریں اُس میں مدغم ہو جاتی ہیں)

(نومبر ۱۹۵۸ء)

کالا چور

ریڈیائی تمثیل

(کنکریلے فرش پر محتاط قدموں کی وزنی، ہم آہنگ مسلسل چاپ ——— دور کہیں گھڑیال بارہ بجائے ——— گھنٹے پر پہلے ایک ساتھ دو دو ضربیں چھ بار اور پھر ایک ایک بارہ مرتبہ لگائی جائیں ——— گھنٹے کی آواز کی گونج میں قدموں کی مدھم لیکن واضح چاپ سنائی دیتی رہے)

پہلی آواز ——— (سرگوشی میں) "استاد! منزل آگئی۔"

(قدموں کی چاپ رُک جائے۔ دیا سلائی سُلگانے کی سرسراہٹ اور مُنہ سے سگرٹ کا دھواں چھوڑنے کی آواز۔ پس منظر میں موسیقی کی ایسی لہریں جو سامعین کا تجسس برقرار رکھیں)

استاد ——— (دبی آواز میں) "سگرٹ وغیرہ پینا ہو تو ابھی وقت ہے۔ سیر ہو کر پی لو۔ اندر پہنچ کر بہت محتاط رہنا ہوگا ———"

(سگرٹ سلگانے اور دھواں چھوڑنے کی آوازیں۔ قدموں کی دبی ہوئی چاپ کنکر چرمراتے رہیں)

استاد ـــــ "تم یہیں ٹھیرو راجو! میں ذرا نکڑ تک دیکھ آؤں۔ کوئی سپاہی نہ ٹپک پڑے"

(قدموں کی چاپ کنکریلے فرش پر بتدریج دور ہوتی جائے۔ وقفہ۔ جلدی جلدی دھواں منہ سے پھونکنے کی آوازیں۔ وقفہ ـــ قدموں کی چاپ بتدریج نزدیک آتی جائے اور مائیک پہ آکر رک جائے)

استاد ـــــ (سرگوشی میں) "میدان صاف ہے۔ راجو سگرٹ پھینک دو اور بہت احتیاط کے ساتھ میرے پیچھے آؤ"

(کنکریلے فرش پر دو آدمیوں کے محتاط قدموں کی چاپ۔ ٹھوکر لگنے کی آواز)

استاد ـــــ (دبی ہوئی آواز میں) "یہ کیا حماقت ہے راجو؟ اتنے دن سے میرے ساتھ چوریاں کر رہے ہو، اب تک پیروں پر قابو نہیں پا سکے۔"

راجو ـــــ "اب بہت سنبھل کر چلوں گا استاد! آواز ہو تو گلا کاٹ دینا"

استاد ـــــ "ذرا یہ دروازہ بہت آہستگی سے کھول کر دیکھو۔ شاید کھلا ہو۔"

(وقفہ۔ معمولی سی کھٹ پٹ کی ہلکی آوازیں)

راجو ـــــ "دروازہ اندر سے بند ہے استاد!"

استاد ـــــ "سوچنا پڑے گا!"

(وقفہ۔ جھینگروں کی مسلسل ریں ریں جو سامعین کا تجسس بڑھاتی رہے)

راجو ـــــ "استاد! اس پانچویں کھڑکی سے روشنی چھن کر باہر آ رہی ہے۔"

استاد ـــــ "آؤ چل کر دیکھیں شاید کوئی صورت نکل آئے۔ میں چاہتا ہوں نقب لگانے کی ضرورت نہ پڑے۔"

(قدموں کی دبی ہوئی محتاط آوازیں اور ہم آہنگ سی چاپ۔ پس منظر میں جھینگروں کی ریں ریں)

راجو ـــــ (تعجب سے) "ارے۔ اس کا تو نچلا تختہ ہی ٹوٹا ہوا ہے۔ میں ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھولے دیتا ہوں۔"

استاد ـــــ "پاگل! پہلے جھانک کر دیکھ لو، اندر کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے۔"

(وقفہ۔ ہلکی ہلکی سانسوں کی آواز کے ساتھ جھینگر کی ریں ریں)

راجو ـــــ "کوئی نہیں ہے استاد۔ بازو میں ایک کمرہ اور ہے لیکن دروازے پر پردہ پڑا ہوا ہے۔"

استاد ـــــ "اچھا تو چٹخنی کھول دو لیکن ٹھہرو! ـــــ کہیں آواز ہو گئی تو سارا کیا دھرا چوپٹ ہو جائے گا۔ میں خود کھولتا ہوں ـــــ"

(وقفہ ـــــ ہلکا سا کھٹکا)

راجو ـــــ "کھل گئی ـــــ واہ استاد! کمال کر دیا!"

استاد ـــــ "خاموش! غیر ضروری باتیں مت کرو۔" آؤ میرے ساتھ!

(دو بار احتیاط کے ساتھ کودنے کی مدھم آواز۔ جھینگر کی ریں ریں کچھ تیز ہو کر دھیرے دھیرے مدھم ہوتی جائے اور پھر کسی ٹائم پیس کی ٹک ٹک میں مدغم ہو جائے)

راجو ـــــ (بہت آہستہ) "استاد ذرا ادھر دیکھنا! یہ الماری ...."

استاد ـــــ (اور بھی آہستگی کے ساتھ) "ذرا دھیرے بولو راجو! ہاں اس الماری میں ضرور مال ہونا چاہیئے، اتنا بڑا تالا لگا رکھا ہے۔"

راجو ـــــ "اس کی چابی اپنے گچھے میں نکل آئے گی۔"

استاد ـــــ "دیکھو کوشش کرتے ہیں ورنہ پھر تالا توڑنا پڑے گا۔"

(کنجیاں کھنکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں۔ گھڑی کی ٹک ٹک جاری رہے)

استاد ـــــ (چونک کر) "ارے راجو! کیسے پاگل آدمی ہو؟ تم ضرور کسی دن

ہتھکڑی پہنو گے۔ جاؤ اس کھڑکی کو اندر سے بند کردو۔ بجلی کا مین سوئچ تلاش کرو تاکہ موقع ملتے ہی آف کر سکو اور پھر اس پردے کے قریب کھڑے رہو۔ کوئی دوسرے کمرے میں بھاگ نہ جائے۔"

(قدموں کی بہت ہلکی چاپ۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک)

استاد ـــــــ "آہستہ۔ آہستہ۔ اور آہستہ۔ شاباش!"

(کنجیوں کی کھنکھناہٹ۔ پس منظر میں ہلکی ہلکی قدموں کی چاپ اور گھڑی کی ٹِک ٹِک۔ وقفہ۔ کھڑکیوں کے پٹ بند ہونے اور چٹخنی چڑھانے کی بہت ہی ہلکی آواز۔ کنجیوں کی کھنکھناہٹ قدرے واضح ہو کر پھر عقب میں چلی جائے اور ٹائم پیس کی ٹِک ٹِک اُبھر آئے۔ اسپرنگ دار تالہ ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ کھلنے کی آواز۔ ہلکی سی چرچراہٹ جیسے کوئی جما ہوا دروازہ دھیرے سے کھولا گیا ہو اور پھر بہت ہی مدھم سی سیٹی کی آواز۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک۔ قدموں کی نپی تلی مدھم آوازیں)

راجو ـــــــ "کھل گیا استاد!؟"

اُستاد ـــــــ "ہاں۔ آج شاید اپنا پہلا ہی وار کام کر گیا۔"

راجو "اِس ڈبّے میں کیا ہے؟"

اُستاد ـــــــ "زیور معلوم ہو......"

(دوسرے کمرے میں ٹائم پیس کا الارم دفعتاً پُرشور آوازیں بجے)

راجو ـــــــ (گھبراہٹ کے ساتھ بھرّائی ہوئی آواز میں سرگوشی) "غضب ہو گیا استاد!"

استاد ـــــــ (آواز دبا کر) "حواس پر قابو رکھّو ـــــ مین سوئچ کہاں ہے؟"

راجو ـــــــ (لرزتی ہوئی آواز میں) "جی! اس کھڑکی کے اوپر۔"

اُستاد ـــــــ "اور اس کمرے میں کیا ہے؟"

راجو ـــــــ "کوئی بیمار عورت سو رہی ہے۔ سرہانے میز پر دوائیں اور ٹائم پیس رکھی ہے۔"

اُستاد ـــــــ "بہت ہلکے قدموں کے جاکر مین سوئچ آف کر دو۔ میں اُس کمرے میں دیکھتا ہوں۔"

(قدموں کی ہلکی ہلکی آوازیں۔ ٹائم پیس کا الارم مُسلسل پُر شور آوازیں بجتا رہے اور پھر اچانک رُک جائے اور گھڑی کی ٹِک ٹِک پھر اُبھر آئے۔ مین سوئچ آف کرنے کا کھٹکا ـــ پلنگ چرمرانے کی آواز۔ چوڑیوں کی چھنک فرش پر گر کر گلاس ٹوٹنے کا چھناکا ـــــــ کُرسی اُلٹنے کی پُرشور آواز اور پھر کسی کے گرنے کا دھماکہ ـــــ مائیک پر راجو اور استاد کے زور زور سے سانس لینے کی آوازیں)

راجو ـــــــ "چلو نکل چلیں استاد!"

اُستاد ـــــــ "وہ اندھیرے میں دوا اُنڈیلنے جا رہی تھی کہ کُرسی سے اُلجھ کر گر پڑی۔"

راجو ـــــــ "نکل چلو اُستاد! میرا دِل دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔"

اُستاد ـــــــ "بزدل ـــــ! یہ زیوروں کا ڈبّہ لے کر گھر چلو، میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔"

راجو ـــــــ "لیکن ......"

اُستاد ـــــــ "میں نے کیا کہا؟ ـــــ بھاگ جاؤ۔ میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔ یہ عورت شاید بے ہوش ہوگئی یا شاید مر گئی۔ خیر تم تو جاؤ ـــ"

(وقفہ ـــ گھڑی کی ٹِک ٹِک۔ استعجابیہ موسیقی کی لہریں ـــ قدموں کی چاپ ـــ کھڑکی کے ہلکے سے چرمرانے، پٹ کے کھُلنے اور پھر بند ہونے کی آواز ـــ مائیک کے بہت قریب قدموں کی آوازیں پھر ایک طویل عرصہ تک۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک ـــ رفتہ رفتہ گھڑی کی آواز اور موسیقی کی لہریں مدھم پڑ جائیں اور کسی عورت کے کرب ناک انداز میں کراہنے کی آواز اُبھر آئے ـــ)

عورت ــــــ (کراہتے ہوئے نحیف آواز میں) "آہ ــــ ...آہ ... میں کہاں ہوں؟"

(وقفہ ــ گھڑی کی مسلسل ٹِک ٹِک)

عورت ــــــ (رُکتے ہوئے) "میں ... کہاں ... ہوں ... یہ ... اندھیرا ... کیسا ... ہے؟"

(وقفہ ــ رات کے سناٹے میں گھڑی کی ٹِک ٹِک اور کشش و پیچ پیدا کرنے والی موسیقی کی ہلکی ہلکی لہریں ــ سانسوں کی آوازیں)

عورت ــــــ (کراہتے ہوئے) "آہ .... میں ... میں ...."

اُستاد ــــــ (ہکلاہٹ کے ساتھ) جی ... جی آپ اپنے مکان ہی میں ہیں۔"

عورت ــــــ (گھبراہٹ کے ساتھ چونکی آواز میں) "لیکن تم کون ہو ــــ؟ میرے کمرے میں کیسے گھس آئے؟ یہ اندھیرا کیسا ہے؟ آہ ... !"

(گھڑی کی ہم آہنگ ٹِک ٹِک ــــ استاد کے گھبراہٹ میں زور زور سے سانس لینے کی آواز ــ عورت متواتر کربناک آواز میں کراہتی رہے)

عورت ــــــ "بولتے کیوں نہیں؟ مجھے تم سے ڈر محسوس ہو رہا ہے۔"

اُستاد ــــــ (آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) "جی ــ دراصل بجلی کی لائن خراب ہو جانے کی وجہ سے آپ کا مکان تاریک پڑا تھا۔ میں اس سامنے والی سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ آپ شاید الارم کی آواز پر بیدار ہوئیں اور پھر اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑیں۔ آپ کی چیخ نے مجھے متوجہ کر لیا اور پھر میں نے بے ہوشی کے عالم میں آپ کو زمین سے اُٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا ــ"

عورت ــــــ "تمہاری آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوتی ہے ــ کیا تم ..."

اُستاد ــــــ (جلدی سے) "نہیں ــ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس شہر میں قطعی نو وارد ہوں .... نہ نہ .... آپ کی طبیعت خراب ہے، اُٹھنے کی

کوشش نہ کیجئے۔ فرمائیے آپ کیا تلاش کر رہی ہیں ؟"

عورت ـــــ "کیا آپ سگرٹ پیتے ہیں ؟"

استاد ـــــ (تعجب سے) "جی ؟"

عورت ـــــ "اگر آپ کے پاس ماچس یا لائٹر ہو تو سلگا کر دیکھئے۔ میری دوا کی شیشی کہیں گر گئی ہے۔"

استاد ـــــ (ہچکچاہٹ کے ساتھ) "جی... جی میں سگرٹ نہیں پیتا۔ مجھے افسوس ہے"

عورت ـــــ (اُلجھن میں پڑ کر) "ہائے اللہ! اب اندھیرے میں کیا کروں ؟"

استاد ـــــ (متاسفانہ لہجے میں) "کیا آپ اِتنے بڑے مکان میں اکیلی رہتی ہیں ـــ"

عورت ـــــ "جی ہاں ـــ" (آہ بھر کر) "اکیلی ہی سمجھئے۔ شوہر ہیں تو اُن کا زیادہ تر وقت طوائفوں کے یہاں گزرتا ہے ـــ"

استاد ـــــ (ہمدردی کے ساتھ) "کتنا ظالم شوہر ہے آپ کا ـــ آپ یہاں بیمار پڑی ہیں اور وہ....."

عورت ـــــ (آہ بھر کر) "وہ ظالم نہیں ہیں ـــ دراصل وہ...... لیکن کیا فائدہ ان باتوں سے ـــ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔ اب آپ....."

استاد ـــــ (جلدی سے) "جی یہ تو میرا فرض تھا۔ لیکن اگر آپ اپنے واقعات سنا سکیں تو شاید میں حقیقی معنوں میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں گا ـــ"

عورت ـــــ (متعجبانہ لہجے میں) "ـــــ جی۔!"

استاد ـــــ "جی ہاں ـــ آپ مجھ پر یقین کیجئے ـــ"

(ایک طویل وقفہ ـــ حزینہ موسیقی کی لہریں اُبھر کر کلائمکس پر پہنچیں اور بتدریج ڈوبتی جائیں اور گھڑی کی ٹِک ٹِک اُبھر آئے۔

عورت ——— (دکھوئی کھوئی آوازمیں) "میرا نام پروین ہے اور انھیں شاہد کہتے ہیں۔ ڈی۔ سی آفس میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ ہماری شادی کو تین سال گزر چکے ہیں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے لیکن ادھر کچھ دِنوں سے یہ محبت نفرت میں تبدیل ہو گئی ہے اور وہ زیادہ تر طوائفوں کے یہاں پڑے شراب پیتے رہتے ہیں ——— آہ!"

استاد ——— "لیکن اس نفرت کی کوئی وجہ تو ہوگی ؟"

(وقفہ ——— گھڑی کی ٹِک ٹِک ـــ سانسوں کی ناہموار آوازیں)

پروین ——— (سرد آہ بھر کر) "دراصل انھیں تمہارے خطوط کا ایک بنڈل میرے بکس میں مِل گیا اور وہی...."

استاد ——— "کیسے خط تھے وہ ——— ؟"

پروین ——— "آپ کی سمجھ میں یوں نہیں آئے گا۔ بات یہ تھی کہ میرے والدین نے پہلے میری شادی ایک دوسرے نوجوان سے طے کی تھی جس کا نام جمال تھا لیکن شرط یہ تھی کہ وہ کوئی اچھی سی ملازمت حاصل کرے۔ وہ ملازمت نہ حاصل کر سکا اس لئے میری شادی شاہد سے کر دی گئی۔"

استاد ——— (بہت تلخ لہجے میں) "تو یوں کہئے کہ آپ کی شادی کسی مرد سے نہیں جیتی جاگتی ملازمت سے کی گئی ہے ؟"

پروین ——— (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) "خیر یوں ہی سمجھ لیجئے۔ شاہد کو جو خطوط میرے بکس سے ملے ہیں وہ کبھی زمانہ میں جمال نے مجھے لکھے تھے۔"

استاد ——— "معاف کیجئے گا ——— کیا وہ مشتبہ خطوط تھے۔"

پروین ——— (قدرے اکتٹ کے ساتھ) "ویسے ہی جیسے دو منگیتروں کے درمیان ہو سکتے ہیں"

اُستاد ـــــ "اور کیا واقعی آپ کو جمال سے محبت تھی ؟"

پروین ـــــ (سرد آہ بھر کر) "میں کہہ نہیں سکتی ـــ اگر مجھے واقعی اس سے محبت تھی تو شاہد کے ساتھ شادی سے انکار کر دینا چاہیئے تھا۔ لیکن میں، اس وقت خاموش رہی۔ اس کے باوجود معلوم نہیں کیوں میں نے جمال کے ان بے معنی خطوط کو ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا۔"

(وقفہ ـــــ ساز کی غمگین لہریں)

استاد ـــــ (ٹھنڈی سانس لے کر) "آپ کی اس مختصر سی روداد نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ فی الحال اجازت دیجئے۔ کسی دن فرصت میں حاضر ہو کر تفصیل سے آپ کے واقعات سنوں گا اور تبھی آپ کے لئے امداد کی کوئی صورت پیدا ہو سکے گی۔ شب بخیر!"

پروین ـــــ (سرد آہ بھر کر) "شب بخیر!"

(قدموں کی چاپ۔ گھڑی کی ٹک ٹک مدھم ہوتی جائے اور جھینگروں کی ریں ریں اُبھر آئے)

راجو ـــــ "بڑی دیر کر دی استاد!"

استاد ـــــ "کون راجو ـــــ؟ تم ابھی یہیں ہو۔ یہ بڑا اچھا ہوا۔ کھڑکی کی راہ سے اندر جا کر یہ ڈبّہ وہیں رکھ دو الماری میں اور تالہ لگا کر بجلی کا مین سوئچ آن کر دینا۔"

راجو ـــــ "لیکن استاد ......"

استاد ـــــ "تم بہت نالائق ہوتے جا رہے ہو راجو! ہر بات پر بحث کرتے ہو۔"

راجو ـــــ "ایک بار اور معاف کر دو استاد! میں ابھی ڈبّہ رکھ کر آتا ہوں۔"

(قدموں کی چاپ دور ہوتی جائے اور جھینگروں کی ریں ریں ابھر آئے)

اور پھر بتدریج مدھم ہوتی ہوئی عقب میں چلی جائے)

استاد ـــــــ (اپنے آپ سے) "یا الٰہی! تجھے میرا یہ دور بھی پسند نہیں آیا۔ کمبخت دل کتنی عجیب سی خلش سے دوچار ہے۔ جی چاہتا ہے.... جی چاہتا ہے کہ...."

(قدموں کی چاپ اُبھرے اور مائیک پر آکر رُک جائے)

راجو ـــــــ "رکھو آیا اُستاد!"

اُستاد ـــــــ "بین سوہنے آن کر دیا تھا نا!؟"

راجو ـــــــ "ہاں۔ لیکن وہ عورت بھی عجیب ہے۔ روشنی ہونے پر سر تک نہیں اُٹھایا بدستور تکیے میں منہ چھپائے روتی رہی۔"

(اُستاد کے سرد آہ بھرنے کی صدائیں ـــ وقفہ ـــ غمگین ساز)

راجو ـــــــ "کیوں کیا بات ہے؟ کچھ غمگین سے نظر آتے ہو اُستاد! اور یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہی کوئی بات ـــ"

استاد ـــــــ (بہت طویل سانس لیکر) "تم ابھی بچے ہو راجو! سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرو۔ ورنہ تمہاری زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے گی میرے دوست ـــ آؤ چلیں۔"

راجو ـــــــ "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

استاد ـــــــ "مول گنج کی طرف چلیں گے۔"

راجو ـــــــ (حیرت سے) "وہاں کیا مال ملے گا؟ وہ تو طوائفوں کا محلہ ہے۔"

استاد ـــــــ (جھڑک کر) "پھر بحث شروع کر دی تم نے ـــ؟"

راجو ـــــــ "میری توبہ جواب کچھ کہوں ـــــ چلیئے"

(قدموں کی مسلسل چاپ کانی دیر تک سنائی دیتی رہے کبھی کنکریلی زمین پر، کبھی پکی سڑک پر، اور کبھی سنگین فرش پر۔ ـــ پس منظر میں رات

کا سناٹا اور بہت ہلکی ہلکی غیر واضح حزنیہ موسیقی۔ کبھی کبھار جاگتے رہو وغیرہ کی دُور سے آتی ہوئی صدائیں۔ درمیان میں دو ایک بار کتے بھونکیں۔ پھر سنگین فرش پر دو آدمیوں کے دبے پاؤں چلنے کی آوازیں واضح سنائی دیں اور مائیک کے سامنے آکر تھم جائیں۔ دروازے کھٹکھٹانے کی آواز۔ عقب میں گھنگھرو، ڈھولک اور ٹھمری کے گانے کی آوازیں۔"

راجو ——— "یہاں کون رہتا ہے استاد؟"

استاد ——— (بدستور دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے) "غنڈوں کا سردار شہر دادا لیٰسین خاں —!"

راجو ——— (ہنس کر) "بہت خوب! کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا — بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ چوروں کا استاد غنڈوں کے سردار سے ملنے آیا ہے!"

استاد ——— "یہ دانت اندر کرلو۔ لیٰسین خاں کے سامنے ہنسو گے تو زمین پر نظر آئیں گے۔"

راجو ——— "باپ رے!"

(چرچرا کر دروازہ کھلنے کی آواز)

لیٰسین خاں ——— (بہت بھاری آواز میں) "اتنی رات گئے کون آیا ہے —؟"

استاد ——— "تم نے پہچانا نہیں دادا ——— میں ہوں......"

لیٰسین خاں ——— (پہچان کر ذرا زور سے) "ارے ——— یہ تم ہے استاد! تم کو ہم کیسے بھول سکتا ہے۔ بڑے نازک موقع پر جان بچائی تھی تم نے ہماری ——— ہم تمھارا احسان عمر بھر یاد رکھے گا ——— آؤ اندر آؤ اندر آؤ ———"

استاد ——— نہیں۔ دادا! آج کچھ مال دال ہاتھ نہیں آیا، کہیں قسمت آزمانے

جاؤں گا۔ تمھارے پاس ایک کام سے آگیا تھا۔"

یٰسین خاں ـــــ "حکم کرو دادا کی جان!"

استاد ـــــ "یہاں بالاخانوں پر جو لوگ آتے ہیں اُن پر نظر تو رکھتے ہوں گے تمہارے آدمی۔؟"

یٰسین خاں ـــــ "مجال ہے جو کوئی ہماری نگاہ سے بچ جائے۔ ہمارا کام ہی کیا ہے۔ موٹی مرغیوں سے پیسے اینٹھنا!"

استاد ـــــ "ایک صاحب ہیں۔ شاہد نام ہے اُن کا۔ تم کو معلوم ہے وہ کس طوائف کے یہاں زیادہ آتے جاتے ہیں؟"

یٰسین خاں ـــــ "کیا سیٹھ ہے کوئی؟"

استاد ـــــ "نہیں دادا! اچھا خاصہ پڑھا لکھا بابو ہے۔ ڈی۔سی۔ آفس میں سپرنٹنڈنٹ ہے۔"

یٰسین خاں ـــــ "اوہ ـــ وہ! ـــ بھئی وہ تو عجیب آدمی ہے۔ اُس کا تو کوئی اسٹینڈرڈ ہی نہیں ہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں ـــ لیکن تم چاہتا کیا ہے؟ ہاتھ پاؤں توڑنا ہے کیا اُس کا؟ یا بالکل صفایا؟"

(چاقو کر گرانے کی آواز)

استاد ـــــ (ہنس کر) "نہیں دادا۔ ہیں ایسا غضب نہ کر بیٹھنا۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ حُسن کی ان گلیوں میں آنا چھوڑ دے۔"

یٰسین خاں ـــــ (زور سے ہنستا ہے) "اوہ دادا کی جان! تم شاعری بھی کرتا ہے ـــ اچھا جاؤ کل سے اُس کا اس محلے میں داخلہ بند!"

استاد ـــــ "نہیں دادا۔ اُسے کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچنا چاہیئے۔"

یٰسین خاں ـــــ "بہت مشکل ہوتی ہے ـــ" (ہچکچا کر) "چلو یہ بھی منظور ہے ـــ

ارے یار استاد! یہ دادا تیرے لئے جان بھی دے سکتا ہے۔"

استاد ——— "اچھا اب چلوں گا دادا! خدا حافظ ——— آؤ راجو!"

دادا ——— "خدا حافظ!"

(دروازہ چرچرا کر بند ہو جائے۔ قدموں کی آہٹ ———
موسیقی کی لہریں۔ وقفہ) ——— کوئی مناسب ساز کافی دیر تک
بجتا رہے۔ جس سے سامعین میں سین تبدیل ہونے کا احساس پیدا ہو جائے
——— پھر چرچرا کر دروازہ کھلنے کی آواز ——— کوئی ماؤتھ آرگن پر
فلمی دھن بجاتا ہوا اندر داخل ہو۔ ساتھ ہی سنگین فرش پر بجتے جوتوں
کی چرمراہٹ)

راجو ——— "واہ! استاد اب تک نہیں لوٹے!"

(ماؤتھ آرگن پر وہی فلمی دھن ——— جوتوں کی چرمراہٹ)

راجو ——— "ارے واہ ——— آج تو استاد نے اتنے بہت سارے خط لکھ ڈالے ہیں۔
دیکھوں تو ......"

(کاغذوں کی سرسراہٹ)

راجو (متحیرانہ انداز میں منہ سے سیٹی بجا کر) "ارے واہ! استاد نے
شہر کوتوال کو بھی خط لکھا ہے" (دیر تک سیٹی بجاتا رہتا ہے) "لفافہ
بند ہے ورنہ پڑھ کر دیکھتا کہ کیسے تعلقات ہیں اپنے استاد کے کوتوال
صاحب سے؟" (پھر دیر تک سیٹی بجاتا ہے) "اور یہ ایک دوسرا لفافہ
بھی تو ہے!" (رک رک کر) "کس کے نام ہے یہ ...... آں ......
جناب شاہد صاحب آفس سپرنٹنڈنٹ ڈی۔سی۔ آفس ...... باپ رے!"

(ماؤتھ آرگن پر وہی فلمی دھن چھیڑ دیتا ہے ——— وقفہ)

راجو ـــــ "یہ دوسرا اوالالفافہ تو ابھی کھلا ہے پڑھنا چاہیئے ـــ اے ... آں ...

(کاغذ سرسرانے کی آواز)

"شاہد صاحب! " (مزے لے لے کر پڑھا جائے) "اگر آپ کو بالا خانے سے فرصت مل جائے تو کل رات کو بارہ بجے ذرا اپنے گھر تشریف لے آیئے گا۔ شاید آپ اس بات کو اِس کان سے سُن کر اُس کان سے نکال نہ دیں اس لئے عرض ہے کہ کوئی مسٹر جلال کل رات کو بارہ بجے آپکی اہلیہ محترمہ سے ملاقات فرمائیں گے۔ اطلاعاً عرض کیا گیا۔ مخلص آپ کا ایک خیر خواہ!"

(کاغذ سرسرانے کی آواز اور ماؤتھ آرگن پہ وہی پرانی دھن دیر تک لہرائے اور پھر یکلخت رُک جائے ـــ طویل وقفہ ـــ رات کی سائیں سائیں ـــ دُور کہیں کُتّے کے رونے کی آواز ـــ اور پھر گھڑیال بارہ بجائے ـــ پہلے گھنٹے پر دو دو ضربیں ایک ساتھ چھ بار پڑیں اور پھر الگ الگ ایک ضرب بارہ مرتبہ ... گھنٹے کی گونج دیر تک سنائی دے)

یمہ دین ـــ (چونک کر) "ہائے اللہ! یہ اچانک بتی کیوں بجھ گئی۔ شاید فیوز اُڑ گیا"

(رات کی سائیں سائیں ـــ طویل وقفہ)

استاد ـــ "کیا میں اندر آسکتا ہوں محترمہ یمہ دین!"

یمہ دین ـــ (چونک کر) "کون ـــ؟"

استاد ـــ "اوہ! شاید آپ بھول گئیں ـــ میں اسی دن والا راہ گیر ہوں ـــ"

(اچانک چاروں طرف سے پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں۔ فرش پر بہت سارے وزنی فل وارجوتوں کی آوازیں)

سب انسپکٹر ـــ (تحکمانہ انداز میں) "استاد! اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہو ورنہ میرے ہاتھ میں پستول ہے!"

اُستاد ۔۔۔ (طنزیہ لہجے کے ساتھ) "جو حکم حضور کا!"

سب انسپکٹر ۔۔۔ "سپاہی! ادھر کونے میں مین سوئچ ہوگا۔ بتیاں روشن کردو!"

(سنگین فرش پر بھاری جوتوں کی آوازیں۔ سوئچ دبانے کا کھٹکا۔ ایک

بہت ہی دلدوز قسم کی طویل نسوانی چیخ اور کسی کے دھم سے گرنے کی آواز)

سب انسپکٹر ۔۔۔ (گھبراکر) "اوہ۔ یہ کیا ہوا ۔۔۔ ؟"

اُستاد ۔۔۔ (جلدی سے) "کچھ نہیں ۔۔۔ میری دہشت سے بیہوش ہوگئی ہے

خدارا مجھے جلد یہاں سے لے چلئے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

سب انسپکٹر ۔۔۔ "سپاہیو! اسے ہتھکڑیاں لگا کر حوالات لے چلو"

(ہتھکڑیاں لگانے اور زنجیر کھنکھنانے کی آواز، فرش پر بہت سے وزنی

جوتوں کی چاپ۔ وقفہ)

شاہد ۔۔۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) "کون ۔۔۔ پولیس؟ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ جمال ۔۔۔

اور یہ پروین کو کیا ہوا؟"

سب انسپکٹر ۔۔۔ "آپ شاید بھاگتے ہوئے آئے ہیں۔ ذرا دم لیجئے۔"

شاہد ۔۔۔ (زور سے) جلدی کہو سب انسپکٹر ورنہ میں مرجاؤں گا۔ جمال کہاں ہے؟

پروین کو کیا ہوا؟"

سب انسپکٹر ۔۔۔ "یہ فرطِ دہشت سے بیہوش ہوگئی ہیں۔ جمال کو گرفتار کرلیا گیا۔"

شاہد ۔۔۔ "آہ میں لٹ گیا۔ برباد ہوگیا۔ پروین! تم نے میری عزت چوراہے پر

نیلام کردی!

سب انسپکٹر ۔۔۔ (حیرت سے) "مسٹر شاہد! آپ تو تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ اتنی دقیانوسی

باتیں نہ کیجئے۔ آپ کی بیوی کی رہنمائی نہ ملتی تو ہم شہر کے اس نامی نقب زن اور

چوروں کے استاد جمال کو ہرگز نہ گرفتار کر پاتے۔"

شاہد ـــــ (رُک رُک کر) "میں سمجھا نہیں انسپکٹر!"

سب انسپکٹر ـــــ "آج ہی تو تو آپ صاحب کو محترمہ پروین کا خط ملا تھا کہ اُن کا سابق منگیتر جمال جو اب شہر کا مشہور لقب زن ہے، انھیں بلیک میل کرنے کی کوشش میں ہے اور وہ آج رات کو بارہ بجے اُن سے ملنے کے لئے گھر پر آئے گا لہٰذا........"

(پروین کے کراہنے کی آواز)

شاہد ـــــ "آہ پروین! مجھے معاف کر دو میں نے تمہیں کتنا غلط سمجھا تھا..."

(طویل غمگین ساز ـــــ وقفہ ـــــ آہنی فرش پر بہت وزنی جوتوں کی آواز۔ لوہے کا پھاٹک کھنکھناتا ہوا کھلے)

سنتری ـــــ "قیدی نمبر تین سو اٹھائیس! تمہیں صاحب بلاتے ہیں۔ کوئی عورت تم سے ملنے آئی ہے۔"

(فرش پر دیر تک قدموں کی ایک وزنی اور ایک ہلکی آواز ـــــ زنجیروں کی کھنکھناہٹ)

استاد ـــــ (چونک کر) "کون پروین؟ تم ـــــ تمہیں یہاں نہ آنا چاہئے تھا ـــــ"

پروین ـــــ (سسکیاں لیتے ہوئے) "بھائی ـــــ! میں اپنے سہاگ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمہاری گرفتاری میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ـــ"

استاد ـــــ (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) "مجھے معلوم ہے پروین! وہ خط کوتوال کو تمہاری طرف سے میں نے خود لکھا تھا اور شاہد بھائی کو بھی ـــــ ہاں پروین! تاکہ تم دونوں کے تعلقات پھر خوشگوار ہو جائیں ـــــ تم پر سے شک کا سایہ دُور ہو جائے!"

(پروین سسکتی ہے۔ غمگین ساز)

استاد ۔۔۔ (بہت گمبھیر جذباتی آواز میں) "پروین! تمھارے والدین کی شرطیں میں نہ پوری کر سکا۔ تمہیں حاصل کرنے کی کوشش میں ہی حالات نے مجھے اس راہ پر لگا دیا ۔۔۔ شکر ہے تمہاری ہی بدولت مجھے اس راستے سے ہٹنے کا موقعہ بھی مل گیا ورنہ لوگ محبت کو بدنام کرتے....."

(پروین کی سسکیاں ۔۔۔ استاد کی آہیں ۔۔۔ زنجیروں کی جھنکار.. یکلخت المیہ موسیقی کا ایک فوارہ سا اُبل پڑے۔ لہریں ابھرتی ہوئی اپنے نقطۂ عروج تک پہنچیں اور پھر بتدریج ہلکی ہوتے ہوئے [illegible]

(اکتوبر ۱۹۶۲ء)